زندہ ممی
KitabPK.Com
مقبول جہانگیر

KitabPK.Com

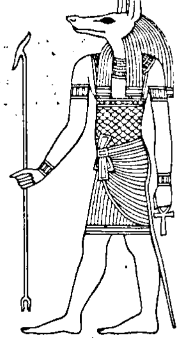

کچھ زندہ ممی کے بارے میں

"ڈریکولا" کے خالق بریم سٹوکر کا نام ڈراؤنی کہانیاں اور افسانے پڑھنے والوں کے لیے تعارف کا محتاج نہیں۔ آج سے اسی برس پیشتر سکاٹ لینڈ کے اِس گمنام شخص نے جب قلم سنبھالا اور کہانیاں لکھنا شروع کیں تو ادب کی دنیا میں ایک عظیم انقلاب آ گیا۔ اور پھر سٹوکر کے پیچھے پیچھے بے شمار لکھنے والے چل پڑے جنہوں نے دنیا میں سنسنی خیز کہانیاں اور ناول لکھ کر نام پیدا کیا اور ادب کی صنف میں ایک نئی طرح کی داغ بیل ڈالی جس کا دائرہ روز بروز پھیلتا جا رہا ہے۔ اگرچہ بعض نقادانِ فن کو اصرار ہے کہ اس نوعیت کی کہانیاں ادب کا حصّہ ہرگز نہیں ہیں۔ یہ ایک علیحدہ اور دلچسپ مبحث ہے جس پر گفتگو کرنے کا یہ محل نہیں، بہرحال یہ بات عجیب ہے کہ وہی لوگ جو ایسی کہانیوں کی مذمت میں زمین آسمان کے قلابے ملاتے رہتے ہیں، تنہائی میں اسی قسم کی کتابیں پڑھتے ہوئے پکڑے گئے ہیں۔

بریم سٹوکر نے زندگی بھر میں کُل چار ناول لکھے۔ اور چاروں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر ہیں۔ "زندہ ممی" کی کہانی اُس کی لازوال تخلیق ہے۔ آج سے چار برس قبل میں نے پاکستان کے ایک مشہور ماہنامے میں اسے قسط وار پیش کرنا شروع کیا تھا۔ ابتدائی دو قسطوں کے بعد جب یہ سلسلہ میری کاہلی کے باعث رُکا تو پڑھنے والوں نے خطوط کا تانتا باندھ دیا اور اصرار کیا کہ اسے مکمل کیا جائے کیوں کہ ایسی دلچسپ، حیرت انگیز اور پُراز معلومات کہانی بہت کم پڑھنے میں آئی ہے۔ بریم سٹوکر کا اپنا ایک خاص اسلوب ہے اور وہ ایسا مشکل ہے کہ اسے اُردو میں ڈھالنا آسان نہیں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ میں نے کئی بار اِس بھاری پتھر کو اٹھایا اور چوم کر چھوڑ دیا۔ واقعہ یہ ہے کہ میں ایمان داری سے سمجھتا تھا کہانی کی رُوح کو انگریزی سے اردو میں منتقل کرنا میرے بس کی بات نہیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہاتھ میں مرحوم عنایت اللہ دہلوی یا مولانا ظفر علی خاں مرحوم کا قلم ہو۔ مگر دنیا میں اکثر کام طبیعت پر جبر کر کے بھی کرنے پڑتے ہیں۔ دوستوں نے مجھے اس سلسلے میں اتنا مجبور کیا کہ میں اس کہانی کے دوبارہ ترجمہ کرنے کی طرف مائل ہو گیا اور جو کچھ کر سکا ہوں وہ آپ کے سامنے ہے۔ پوری کتاب اگر اُردو میں منتقل ہوتی تو اس کی ضخامت بلاشبہ پانچ سو صفحات سے کم نہ ہوتی، مگر کاغذ کی قلت اور قاری میں قوت

خریدِ زیادہ نہ ہونے کے باعث اس تمام مواد کو ۲۵۶ صفحات میں سمیٹنا پڑا جو بجائے خود ایک مشکل مرحلہ تھا۔

بہرحال کتاب آپ کے سامنے ہے۔ اس کو عمدہ طباعت اور نفاست سے پیش کرنے کا سہرا جن دوستوں کے سر ہے اُن کا شکریہ ادا نہ کروں تو قلب پر بار رہے گا۔ امجد رؤف خاں' ارشد جاوید کا میں خاص طور پر شکر گزار ہوں کہ اُن کی توجّہ اور محنت کے باعث یہ کتاب آپ کی خدمت میں پہنچ سکی ہے۔ اگر آپ نے میری حوصلہ افزائی کی تو کوشش کروں گا کہ بریم سٹوکر کے بقیہ تین ناول بھی اُردو میں منتقل کر کے آپ کی خدمت میں بہت جلد پیش کر دوں۔

بشرل بناگر

KitabPK.Com

ممی

"ڈریکولا" کے بعد دُنیا کی دوسری سب سے زیادہ خوفناک کہانی

KitabPK.Com

ایک بھیانک رات

اِس سے پیشتر کہ مَیں اس پُراسرار، لرزہ خیز اور بعید از فہم داستان کا آغاز کروں، مختصر الفاظ میں اپنا تعارف کرا دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ میرا نام مالکم رُوز — بہ پیشہ بیرسٹری... عمر اٹھائیس سال... لندن کی بارونق شاہراہ جرمن سٹریٹ میں میرا دفتر ہے اور یہیں رہائش بھی — لندن کے اونچے اور معزز حلقوں میں خُوب جانا پہچانا جاتا ہوں۔ بھُوت پریت، بدرُوح اور آسیب سے میرا کبھی واسطہ نہیں پڑا اور نہ مَیں ان بیہودہ باتوں کا کبھی قائل ہُوا۔ شاید اس لیے کہ آج میں یہ سطریں لکھنے بیٹھا ہوں تو اعتراف کرتا ہوں کہ ہماری اس جیتی جاگتی، کرۂ ارض کی دنیا سے الگ ایک اور عجیب دنیا بھی موجود ہے۔ مَیں نے اِس دنیا کا ہلکا سا مشاہدہ کیا ہے جو اتنا خوف ناک اور تحیّر انگیز ہے کہ اس پر یقین کرنا آسان نہیں، لیکن خدائے لایزال کی قسم، مَیں جو کچھ لکھوں گا، وہ حقیقت پر مبنی ہو گا۔ اس میں ذرّہ برابر مبالغہ نہیں۔ واقعات کچھ اس انداز میں میرے سامنے پیش آئے ہیں کہ ذہن عرصے تک ماؤف رہا اور اب بھی — اتنے برس گزر جانے کے بعد — کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ میں نے جو کچھ دیکھا اور جو کچھ سُنا، کیا واقعی ایسا ہی ہوا تھا؟ شاید میں ان بھیانک واقعات کو مرتے دم تک فراموش نہ کر سکوں — وقت تیزی سے گزر رہا ہے... بہت تیزی سے... گزشتہ زندگی

کے بے شمار واقعات وحادثات حافظے سے نکل چکے ہیں، لیکن یہ ہولناک واقعہ میرے حافظے کی سوح پر روزِ اوّل کی طرح روشن ہے۔

وہ سردیوں کی ایک کہر آلود اور نہایت تاریک رات تھی۔ لندن کا موسم تو ویسے بھی تکلیف دہ رہا ہے، لیکن جب مُسلسل بارش ہو رہی ہو اور لمحہ بہ لمحہ سردی بڑھتی جائے، حتیٰ کہ آتش دان میں بھڑکتے ہوئے شعلے بھی سردی سے کانپنے لگیں، تو زندگی سے نفرت ہونے لگتی ہے۔ گزشتہ کئی روز سے لندن کا یہ بے ہودہ موسم اذیت پہنچا رہا تھا۔ سُورج نکلنے کا نام نہ لیتا تھا۔ میرے دفتر میں اُس دن بھی مؤکلوں کا بے پناہ ہجوم رہا۔ ہر طرح کے مؤکل ــــ بُڈھے، جوان، .... مرد .... عورتیں .... بھانت بھانت کی بولیاں .... کوئی بیوی سے طلاق لینا چاہتا ہے .... کسی پر چوری کا مقدمہ بن گیا ہے .... کوئی قتل کے الزام میں ملوث ہے۔ یہ روز کا معمُول تھا اور مَیں ان باتوں کا عادی ہو چکا تھا، مگر اس روز مؤکلوں نے مجھے بہت تنگ کیا۔ خاص طور پر چند چڑچڑے دو بُڈھوں نے ــــ جن کے کرائے دار کرایہ ادا کیے بغیر مکان خالی کر گئے تھے۔

مغرب کے وقت میرے ملازم نے اعلان کیا کہ اب کوئی مؤکل باقی نہیں رہا اور اس نے دفتر کا دروازہ بند کر دیا ہے۔ تب میں نے اطمینان کا سانس لیا اور دل میں سوچا کہ چند روز کامل آرام کرنا ضروری ہے، ورنہ مَیں بیمار ہو گیا تو میری دیکھ بھال کون کرے گا۔ بدقسمتی سے دنیا میں تن تنہا ہوں اور ابھی تک شادی بھی نہیں کر سکا۔ مَیں جس قسم کی بیوی چاہتا تھا، وہ لندن میں ایک جگہ کے سوا کہیں نظر نہ آئی اور اس سے شادی کرنا ممکن نہ تھا، لہٰذا یہ پروگرام بھی ٹلتا رہا۔

قصّے کو مختصر کر کے اپنے مطلب پر آتا ہوں۔ مَیں نے اپنے مددگار وکیل اور دوسرے ملازموں کو رخصت کیا، ذاتی ملازم بھی شب بخیر کہہ کر اپنے کوارٹر میں چلا گیا اور مَیں اپنے کمرے میں آیا۔ کھانا گرم کر کے زہر مار کیا اور فوراً گرم گرم بستر میں گھُس گیا۔ سخت تھکا ماندہ تھا اس لیے نیند جلد آنے کا امکان تھا، لیکن نہ جانے کیوں دل آپ ہی آپ بیٹھا جا رہا تھا۔ جرمن سٹریٹ کے باہر ٹریفک کا شور مدّھم پڑ چکا تھا اور کہر ہر لمحہ بڑھتی جا رہی

تھی۔ کبھی کبھار کسی کتّے کے رونے کی منحوس آواز بلند ہوتی تھی غالباً یہی آواز تھی جس نے میرا ذہنی سکون تہ و بالا کر دیا تھا۔

دیر تک اسی طرح کروٹیں بدلتا رہا۔ پھر کچھ غنودگی سی طاری ہو گئی .... دفعتہً یُوں محسوس ہوا جیسے مَیں ایک بہت بڑے برفانی علاقے میں پہنچ گیا ہوں۔ میرے چاروں طرف سر بفلک پہاڑوں کی چوٹیاں ہیں۔ یکایک ایک چوٹی پر سے برف کا ایک عظیم تودہ ٹوٹ کر لڑھکتا ہوا میری طرف آتا ہے .... یہ تودہ ہزاروں من وزنی ہے اور مَیں دیکھتا ہوں کہ اب بچاؤ کی کوئی صورت نہیں ہے۔ مَیں اس سے بچنے کے بھاگتا ہوں، لیکن فوراً ہی ہر طرف سے قیامت خیز دھماکوں کے ساتھ تودے ٹوٹ ٹوٹ کر میری طرف لڑھکنے لگتے ہیں ... اور پھر ایک گھٹی گھٹی چیخ کے ساتھ میری آنکھ کھُل جاتی ہے۔ میرا بدن پسینے میں تر ہے .... دِل بُری طرح دھڑک رہا ہے۔ اس شدید سردی میں بھی یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے میرے بستر میں انگارے بھر دیے گئے ہیں۔ خدا کی پناہ..

کیسا بھیانک خواب تھا .... میں سرہانے رکھے ہوئے پانی کے گلاس کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہوں کہ دفعتہً برقی گھنٹی زور سے بجنے لگتی ہے ... یہ گھنٹی میری خوابگاہ کے باہر لگی ہوئی ہے اور اس کا بٹن عمارت کے صدر دروازے پر ہے۔ گھنٹی مُسلسل چیخ رہی ہے .... اور مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے میرے اعصاب پر کوئی اَن دیکھی طاقت ہتھوڑے برسا رہی ہے۔ خدا رحم کرے ... اس وقت کس پر آفت آئی ... ضرور کوئی مؤکل ہے.... کیا کروں ... گھنٹی بجنے دوں؟ مجھ سے اس وقت اُٹھا نہ جائے گا اور پھر یہ کوئی آنے کا وقت ہے .... مَیں نے کلاک کی طرف نگاہ کی۔ اس کی چمکتی ہوئی سوئیوں نے بتایا کہ تین بجے ہیں ــــ شاید وہ جواب نہ پا کر چلا جائے ... ٹل جائے ... مگر نہیں ... گھنٹی بار بار بج رہی تھی .... اب تو پاس پڑوس والے بھی اس کے شور سے جاگ اُٹھے ہوں گے ... مَیں اپنی قسمت کو کوستا ہوا اُٹھتا ہوں اور ڈریسنگ گون پہن کر کمرے سے باہر نکلتا ہوں۔ آسمان اب بھی ابر آلود ہے۔ سرد ہواؤں کے جھکّڑ چل رہے ہیں اور ہلکی ہلکی پھُوار پڑ رہی ہے۔

جب میں صدر دروازہ کھولتا ہوں تو مجھے ادنیٰ حیثیت کے دو آدمی دکھائی دیتے ہیں۔ ایک کوچبان کی وردی میں ہے اور دوسرا اس علاقے کا چوکیدار ہے۔ اس کے ہاتھ میں لالٹین ہے۔ دونوں مجھے دیکھتے ہی ایک قدم آگے بڑھ آتے ہیں۔ کوچبان کے ہاتھ میں ایک لفافہ ہے۔ مجھے سلام کر کے کہتا ہے:

"معاف کیجیے جناب، کیا ڈاکٹر مالکم رُوز یہیں رہتے ہیں؟"

جواب دینے سے پہلے میں سڑک کی طرف دیکھتا ہوں۔ سیاہ رنگ کی ایک شاندار گھوڑا گاڑی کھڑی ہے۔ اس میں جُتے ہوئے دونوں سیاہ گھوڑے نہایت قدآور اور بہترین نسل کے ہیں۔ اُن کے منہ سے سفید سفید بھاپ نکل رہی ہے۔ غالباً ہانپ رہے ہیں۔ شاید بہت دُور سے آئے ہیں۔

"ہاں، میرا نام مالکم رُوز ہے۔ تم کہاں سے آئے ہو؟"

"سرکار، یہ لفافہ آپ کے لیے ہے۔" کوچبان نے دوبارہ اپنی ٹوپی چھُو کر کہا۔ "ہماری مالکن نے آپ کا پتہ بتایا تھا اور کہا تھا کہ بیرسٹر صاحب کو ابھی دے کر آؤ اور اُن کا جواب یہیں لا کر دو۔"

مَیں نے لفافے کو دیکھا۔ اس پر زنانہ تحریر میں میرا ہی نام لکھا تھا۔ مَیں نے دھڑکتے دل سے لفافہ چاک کیا۔ نیلے رنگ کے ایک عمدہ کاغذ پر القاب و آداب کے بغیر یہ چند سطریں لکھی تھیں:

"آپ نے ایک مرتبہ مجھ سے فرمایا تھا کہ کسی بھی لمحے اگر مدد کی ضرورت پڑے تو آپ دل و جان سے حاضر ہوں گے۔ سمجھ لیجیے کہ اب وہ وقت آن پہنچا ہے کہ آپ اپنا عہد پورا کریں۔ دراصل مجھے اس وقت کے آنے کا احساس تو تھا، مگر یہ اُمید ہرگز نہ تھی کہ اتنی جلد آجائے گا۔ مَیں اس وقت جس مصیبت سے دوچار ہوں، اس کا ذکر زبانی کروں گی، صرف اتنا لکھے دیتی ہوں کہ کوئی نامعلوم ہستی میرے والد کو قتل کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ ایک مرتبہ حملہ ہو چکا ہے اور والد شدید زخمی

ہونے کے باوجود ابھی تک زندہ ہیں۔ اُن کی نبض دھیمی رفتار سے چل رہی ہے، مگر وہ بے ہوش پڑے ہیں۔ مَیں نے ڈاکٹر اور پولیس کو بُلانے کے ساتھ ساتھ آپ کی جانب بھی اپنا آدمی بھیجا ہے، مَیں بالکل تن تنہا ہوں۔ کسی پر اعتماد نہیں کر سکتی۔ آپ کو اس قابل سمجھتی ہوں۔ حالات نہایت پُراسرار اور از حد حیران کن ہیں۔ خدا کے واسطے جلد آیئے۔ مَیں آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہ بھُولوں گی۔

مارگریٹ ٹریلانی"

جوں جوں یہ خط مَیں پڑھتا جاتا تھا، دل میں درد کی ٹیسیں بڑھتی جاتی تھیں۔ آہ، بے چاری مارگریٹ ٹریلانی، وہ معصوم اور حسین لڑکی کس آفت میں پھنس گئی۔ اس سے تمام گذشتہ ملاقاتیں اور باتیں یاد آنے لگیں۔ اب پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ مجھے اس لڑکی سے شدید محبت ہے۔ . . . اور وہ اس وقت میری مدد کی طالب ہے۔ مَیں نے کوچبان سے کہا:

"تم یہیں ٹھہرو، مَیں ابھی کپڑے بدل کر آتا ہوں اور تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔"

پھر مَیں تقریباً دوڑتا ہوا اپنے ڈریسنگ روم کی طرف گیا۔ جلد جلد ہاتھ منہ دھو کر کپڑے پہنے اور گاڑی میں سوار ہو کر ایک پُراسرار مہم کی طرف روانہ ہُوا۔ لندن کے گلی کوچے سنسان پڑے تھے۔ بارش اب تیز ہو گئی تھی —— کسی کسی شراب خانے میں سے شرابیوں کے چیخنے اور گانے کی آوازیں اس سناٹے کو چیرتی ہوئی نکل جاتی تھیں۔ گھوڑے پوری رفتار سے دوڑ رہے تھے اور کوچبان مسلسل چابک برسا رہا تھا۔ تمام راستے مَیں مارگریٹ کے والد مسٹر ٹریلانی کے بارے میں سوچتا رہا۔ کوچبان نے صرف اتنا بتایا کہ مسٹر ٹریلانی پر کسی نامعلوم شخص نے حملہ کر کے بُری طرح زخمی کر دیا ہے۔ پورے لندن میں اُن کا کوئی شخص دشمن نہیں تھا، پھر ایسا کیوں ہُوا . . . ؟

"سرکار، مسٹر ٹریلانی اپنے کمرے میں پائے گئے——" کوچبان نے کہا۔ "اُن کے کپڑے خون میں لت پت تھے۔ ایک گہرا زخم سر پر آیا تھا۔"

"سب سے پہلے کس نے انہیں اس حالت میں پایا۔؟" میں نے پوچھا۔

"اُن کی بیٹی نے سرکار ــــ"

"تعجب ہے ــــ آخر آدھی رات کے بعد مس مارگریٹ کو اپنے والد کے کمرے میں جانے کی کیا ضرورت پیش آئی ــــ ممکن ہے اُنہوں نے اپنے والد کی چیخ وغیرہ سُنی ہو ــــ"

"ہاں، یہ بھی ممکن ہے ــــ" کوچبان نے جواب دیا۔

صبح کاذب کا دھندلکا آہستہ آہستہ اُجالے میں بدل رہا تھا۔ آسمان پر بادلوں کے آوارہ ٹکڑے بکھر رہے تھے۔ بارش چند لمحوں کے لیے تھم گئی۔ اب ہم لندن کے فیشن ایبل علاقے سے گزر رہے تھے۔ سڑک پر گاڑی کے دوڑنے اور گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز کا شور اکّا دُکّا راہگیروں کو اپنی طرف متوجّہ کر رہا ہے۔ سڑکوں کی صفائی کرنے والے اپنی ڈیوٹی پر آ گئے ہیں اور سبزیاں، دُودھ کی بوتلیں اور اخبار لانے لیجانے والی گاڑیاں بھی بھاگتی نظر آ رہی ہیں۔

کنگسٹن برج پار کرتے ہی ہماری گھوڑا گاڑی ایک بلند اور شاندار عمارت کے صدر دروازے پر پہنچ کر رُک گئی۔ کوچبان نے اپنی نشست سے اُتر کر گاڑی کا دروازہ کھولا اور مجھے نیچے اُترنے میں مدد دی۔ اِس چوڑی اور صاف ستھری سڑک کے بالکل سامنے بائیں ہاتھ پر مجھے ٹاؤننگ ہال کی عمارت نظر آ رہی ہے۔ یہاں سبھی عمارتیں ایک دوسری سے بڑھ چڑھ کر ہیں، لیکن میں جس جگہ آیا ہوں، وہ اِس علاقے کی سب سے عالیشان عمارت ہے۔ اس کا فنِ تعمیر قدیم، مگر شاہانہ ہے۔ بھاری صدر دروازہ لکڑی کا ہے اور اس پر نہایت نازک بیل بوٹے بنے ہوئے ہیں۔ ڈیوڑھی میں برقی روشنی ہو رہی ہے۔ اِدھر اُدھر دو تین کاریں بھی کھڑی ہیں۔ ان میں ایک پولیس کار بھی موجود ہے۔

ہال کمرے میں داخل ہوتے ہی میں نے دیکھا کہ مارگریٹ ٹریلانی ایک پولیس افسر سے باتیں کر رہی ہے۔ اس کے حسین چہرے پر غم و اندوہ کے گہرے سائے پھیلے ہوئے ہیں۔ مجھے دیکھ کر وہ تیزی سے آئی۔ اب میں نے دیکھا کہ اس کے ترشے ہوئے سرخ

ہونٹ بُری طرح کانپ رہے ہیں اور رو رو کر اُس کی آنکھیں سُوجی ہوئی ہیں۔ ایک کرب آمیز تبسم سے اُس نے میرا استقبال کیا اور بھرّائی ہوئی آواز میں بولی:

"مجھے یقین تھا آپ ضرور آئیں گے۔"

یہ کہہ کر اس نے مصافحے کے لیے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ میں نے اس کا سبک اور دلکش سفید ہاتھ آہستہ سے تھام لیا۔ میرے جسم میں بجلی کی ایک لہر سی دوڑ گئی؛ یوں محسوس ہوا جیسے میرا ہاتھ دہکتے ہوئے کوئلوں پر جا پڑا ہو۔ میں نے کئی مرتبہ مس ٹریلانی کے ہاتھوں کو دیکھا اور چھُوا تھا اور میرا خیال تھا ایسا نرم و نازک ہاتھ اور اتنی لمبی سفید انگلیاں دُنیا میں کسی اور عورت کی نہ ہوں گی ــــ

آہستہ سے اپنا ہاتھ چھڑا کر وہ پولیس افسر کی طرف مُڑی اور کہنے لگی:

"یہ میرے دوست مسٹر مالکم رُوز ہیں۔"

پولیس افسر نے مجھے سیلوٹ کیا اور کہا:

"میں انہیں بخوبی جانتا ہوں۔ کیوں جناب والا، آپ کو برکسٹن والا کیس تو یاد ہو گا جس میں مجھے آپ کے ساتھ کام کرنے کا فخر حاصل ہُوا تھا۔؟"

اور تب مجھے یاد آیا کہ یہ شخص سپرنٹنڈنٹ ڈولین ہے۔ میں نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ ایسا معلوم ہوا کہ پولیس افسر سے میری پُرانی واقفیت مس ٹریلانی کے لیے خوشگوار ثابت ہوئی، کیونکہ اس کے چہرے پر اب اطمینان کی جھلک نظر آنے لگی تھی۔

پولیس افسر سے چند منٹ کی رسمی بات چیت کے بعد میں نے کہا:

"اگر آپ اجازت دیں تو میں مس ٹریلانی سے علیحدگی میں کچھ بات کروں۔ اس کے بعد میں آپ سے اِس المناک حادثے کے مختلف پہلوؤں پر بحث کروں گا۔"

"جناب والا، اِس میں اجازت کی کیا ضرورت ہے؟ میں ہر خدمت کے لیے حاضر ہوں۔" ڈولین نے سر جھکا کر جواب دیا۔

میں مس ٹریلانی کے ساتھ اس پُرشکوہ اور عظیم عمارت کے برآمدوں اور گیلریوں سے گزرتا ہُوا ایک فراخ اور خوش نما کمرے میں داخل ہوا۔ اس کمرے کا دوسرا دروازہ عمارت

کے وسیع اور ہرے بھرے لان میں کھلتا تھا۔ اب میں نے گہری نظروں سے اس کمرے کا جائزہ لیا۔ دروازوں اور کھڑکیوں پر بھاری، سیاہ رنگ کے ریشمی پردے لٹک رہے تھے اور چاروں طرف سجا ہوا فرنیچر اتنا بیش قیمت تھا کہ ایک لمحے کے لیے میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ پھر مجھے مس ٹریلانی کے والد کی بے پناہ دولت یاد آئی اور اس کے جنون کا بھی احساس ہوا کہ دنیا بھر سے طرح طرح کے نوادر جمع کرکے لانا اور اس مکان میں سجانا اس کا بہترین مشغلہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ مکان کیا تھا، ایک نادر روزگار میوزیم تھا۔ عمارت کے بے شمار کمروں، گیلریوں، تہ خانوں اور راہداریوں میں ان گنت تاریخی اور انتہائی قیمتی اشیا شوکیسوں میں سجی ہوئی تھیں۔ قالین، فرنیچر، برتن، ہتھیار، جانوروں کی کھالیں، مجسمے، قبروں کے کتبے، قدیم عمارتوں اور مقبروں کی چوبی دیواریں اور سالم دروازے، بادشاہوں کے استعمال کی صدہا چیزیں، ہیرے جواہرات، پرانی کتابیں اور مصر کے بادشاہوں اور شہزادے شہزادیوں کے اہرام سے لائی ہوئی بہت سی حنوط شدہ لاشیں ـــــ وہ افریقہ، ایشیا اور یورپ کی مردہ زبانیں ماہرانہ انداز میں جانتا تھا اور ہزاروں سال قدیم مصری تہذیب و تمدن کے ٹھوس مطالعے اور آثار کے مشاہدے میں کوئی اس کا ثانی نہ تھا۔ فرعونوں کے مقابر کی دیواروں پر کھدے ہوئے نقوش اور تصویروں کو وہ یوں فر فر پڑھتا کہ بڑے بڑے ماہرین آثار قدیمہ حیران رہ جاتے۔ اس نے بے شمار گم شدہ مقابر کا سراغ لگایا، ان کی کھدائی کی اور بیش بہا خزانوں کا مالک بن گیا۔

مجھے معلوم تھا کہ اپنے ذوق اور فن کے آدمیوں کے سوا اس کا میل جول کسی سے نہ تھا۔ اس کی بیوی مر چکی تھی اور اس کے بطن سے ٹریلانی کی یہی ایک لڑکی تھی جسے اس نے تمام مصائب اور تکالیف سے دور امریکہ کے ایک اعلیٰ درجے کے ہوسٹل میں رکھا اور قابل استادوں کی مدد سے اس کی پرورش اور تربیت کی۔ لڑکی کو چونکہ اپنے باپ کے پاس رہنے کا زیادہ موقع نہیں ملا تھا، اس لیے وہ اس کے بارے میں کچھ زیادہ نہ جانتی تھی۔ اس کے باپ نے مصر کی ایک تازہ مہم سے واپس آنے

کے بعد لندن میں رہنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ شاید اس لیے کہ اس کی بیٹی جوان ہو چکی تھی اور اب اس کا غیروں میں رہنا ٹھیک نہ تھا، لیکن اتنے بڑے اور عالی شان مکان میں، جو عجیب و غریب نوادر سے پٹا پڑا تھا، اور جس میں مصری ممیوں کی بڑی تعداد شوکیسوں میں بند تھی، نوجوان لڑکی کا دم گھٹتا تھا۔ اسے اپنے گھر میں بدروحوں کی موجودگی کا احساس ہوتا اور یہ تمام باتیں اس نے مجھے ایک محفل رقص میں، ملاقات کے دوران میں بتائی تھیں۔ اس کا باپ صرف ناشتے کے وقت اپنے کمرے سے نکلتا، ورنہ سارا سارا دن اور ساری ساری رات کمرے میں بند نہ جانے کیا کرتا تھا۔ گھر کے کسی ملازم کو مقررہ اوقات کے علاوہ اس کے کمرے میں جانے کی اجازت نہ تھی۔ شکل صورت اور قد و قامت کے اعتبار سے وہ نہایت بارعب اور قوی ہیکل آدمی تھا اور عمر کے ساٹھ سال گزارنے کے باوجود اب بھی اتنی جان رکھتا تھا کہ اچھے خاصے جوان آدمی کے گھونسا مار دے تو پانی نہ مانگے، لیکن تعجب تھا، ایسے قوی شخص پر کسی نے حملہ کیا اور شدید گھائل کر کے فرار ہو گیا۔

ایک نرم اور شاندار صوفے پر مجھے بیٹھنے کا اشارہ کر کے وہ خود سامنے پڑی ہوئی آبنوس کی کرسی پر بیٹھ گئی۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد اس نے شیریں اور دل موہ لینے والے لہجے میں کہا:

"مسٹر مالکم روز، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کی آمد کا شکریہ کن الفاظ میں ادا کروں۔ سچ پوچھیے تو اس مکان کے چپے چپے سے مجھے خوف آتا ہے۔ جی چاہتا ہے یہاں سے بھاگ جاؤں۔"

ایک ثانیے کے لیے وہ رکی اور پھر گویا ہوئی:

"اگرچہ آپ سے بھی میری شناسائی کی مدت کچھ زیادہ نہیں، تاہم چند ملاقاتوں کے بعد میں نے اندازہ کیا تھا کہ آپ اچھے آدمی ہیں اور پھر آپ کا وہ قول بھی مجھے یاد ہے کہ جب ضرورت پڑے، آپ میری مدد کریں گے۔ اسی خیال کے زیر اثر میں نے آپ کو زحمت دی ہے۔"

مَیں نے پورے اعتماد سے جواب دیا :

"مَیں ہر ممکن خدمت کے لیے حاضر ہوں۔ آپ میری زحمت کا کوئی خیال نہ فرمائیے۔ اَب مَیں پُورا قصّہ آپ کی زبانی سُننے کے لیے بے چین ہوں۔"

"دیکھیے، مَیں عرض کرتی ہوں۔ اصل واقعات یہ ہیں کہ آدھی رات کے بعد اچانک میری آنکھ کُھلی۔ میرا کمرہ والد کی خواب گاہ سے قریب ہی ہے۔ اتنا احساس ہوا کہ مَیں نے ایک عجیب سی آواز سُنی تھی۔ مَیں پوری طرح تشریح نہیں کر سکتی کہ یہ آواز کس قسم کی تھی ؛ تاہم اس کا اثر اتنا قوی تھا کہ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور جسم کے رونگٹے سرسرانے لگے۔ چند لمحوں بعد مَیں نے یہی پُراسرار آواز دوبارہ سُنی اور اس مرتبہ معلوم ہوا کہ یہ میرے والد کے کمرے سے آئی تھی۔ کبھی کبھی مجھے والد کے چلنے پھرنے اور اپنے آپ باتیں کرنے کی آوازیں بھی سنائی دیا کرتی تھیں، کیوں کہ وہ رات گئے تک کام کرنے کے عادی ہیں اور بعض اوقات تو صبحِ صادق تک کچھ نہ کچھ کرتے ہی رہتے ہیں۔ نہ معلوم کیا کیا —— یہ مجھے آج تک پتہ نہ چلا۔ ایک مرتبہ مَیں نے اس خیال سے کہ رات رات بھر جاگنے سے اُن کی صحت پر بُرا اثر پڑے گا، درخواست کی تھی کہ ابّا، آپ اتنی دیر تک کام نہ کیا کریں۔ یہ سُن کر وہ سخت ناراض ہوئے اور پھر اُن کے سفید سفید نوکیلے دانت دیکھ کر دہشت کے مارے میرا بُرا حال ہو گیا۔ اُس وقت وہ کسی خونخوار بھیڑیے کی مانند نظر آ رہے تھے، مگر دوسرے ہی لمحے اُن کی حالت بدل گئی اور انھوں نے نرمی سے مجھے سمجھایا کہ آئندہ ایسی بات نہ کہنا۔ مَیں اپنا کام کاج رات ہی کے وقت کیا کرتا ہوں۔ خیر، مَیں نے اس آواز پر غور کیا، تب احساس ہوا کہ یہ میرے والد کے چلنے پھرنے کی آواز تو نہیں ؛ البتّہ کوئی شخص زور زور سے سانس لے رہا ہے یا پھر یہ خرّاٹے تو کبھی نہیں لیتے۔ پھر یُوں سنائی دیا جیسے کوئی چیز فرش پر گھسیٹی جا رہی ہو۔ آواز کبھی تیز ہو جاتی، کبھی مدھم۔ مجھ سے نہ رہا گیا۔ اپنے بستر سے اُٹھی اور دبے پاؤں والد کے کمرے کی طرف چلی۔ باہر برآمدے میں گھُپ اندھیرا تھا اور مَیں دروازے کے ساتھ لگ کر آواز سُننے لگی۔ پھر مَیں نے دروازے کا ہینڈل آہستہ سے گھمایا۔ دروازہ

کسی ہلکی سی آواز کے بغیر کُھل گیا۔ کمرے میں روشنی کی کوئی کرن نہ تھی۔ چند لمحے بعد مجھے کھڑکیوں کے کنارے دکھائی دیے۔ سانس لینے کی آواز اب مُسلسل آ رہی تھی جیسے کوئی ہانپ رہا ہو۔ مَیں نے جرأت کر کے کمرے میں قدم رکھا اور جلدی سے دائیں ہاتھ دیوار پر لگا ہوا برقی قمقمے کا بٹن دبا دیا۔ بٹن دباتے ہی کمرہ روشنی سے جگمگا اُٹھا۔

سب سے پہلے میری نگاہ والد کے بستر پر گئی۔ سفید چادر پر شکنیں پڑی تھیں اور سُرخ کمبل ایک طرف ڈھلکا ہوا تھا، لیکن والد بستر پر نہ تھے۔ مَیں ایک قدم اور آگے بڑھی۔ اَب مَیں نے دیکھا کہ بستر کے عین درمیان میں تازہ خون کا بہت بڑا داغ پھیلا ہُوا ہے۔ پھر خون کے چھوٹے بڑے دھبّے چادر کے کنارے پر بھی نظر آئے۔ خوف سے میرے دل کی حرکت جیسے بند ہونے لگی —— بڑی مسہری کی پرلی طرف سے سانسوں کے زیر و بم کی آواز بدستور آ رہی تھی۔ میری ٹانگیں تھرتھرا رہی تھیں اور ہاتھ لرز رہے تھے۔ چند قدم اور آگے بڑھی اور پھر مَیں نے دیکھا کہ . . . ."

مِس ٹریلانی نے دونوں ہاتھوں سے اپنا حسین چہرہ چھپا لیا اور سسکیاں بھرنے لگی :

"آہ . . . مَیں نے دیکھا کہ والد آہنی سیف کے پاس اوندھے منہ پڑے ہیں اور ان کے اردگرد خُون ہی خُون بکھرا ہُوا ہے۔ گاڑھا، تازہ، گرم اور سُرخ سُرخ خُون —— مگر وہ ابھی تک زندہ تھے۔ ان کا سینہ حرکت کر رہا تھا اور سانس کی آواز ناک کے رستے باہر نکل رہی تھی۔ والد شب خوابی کے لباس میں تھے۔ مَیں نے دیکھا اُن کی بائیں آستین پھٹی ہوئی ہے اور ہاتھ سیف کی طرف اس انداز میں پھیلا ہُوا ہے جیسے سیف کو بچانے کی کوشش کر رہا ہو —— لیکن . . . اس ہاتھ پر کہنی سے لے کر کلائی تک نہایت گہرا گھاؤ تھا جیسے کسی درندے نے اپنے نوکیلے پنجے [illegible] اُدھیڑ کر رکھ دیا ہو۔ پُورا بازو خون میں لتھڑا ہوا تھا اور تیز روشنی میں کٹی ہوئی رگیں مجھے صاف نظر آ رہی تھیں، حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اُن کی کلائی میں سونے کی ایک چوڑی [illegible] تھی۔ مَیں نے اس سے پیشتر یہ چوڑی اُن کی کلائی میں کبھی نہیں دیکھی تھی ——

اُس نے رومال سے آنسو پونچھے اور کسی گہری سوچ میں کھو گئی۔ مَیں نے کہا :

" اس میں حیران ہونے کی کیا بات ہے۔ بہت سے مرد طلائی چوڑیاں پہنتے ہیں۔ مثلاً یہ رسم ہے کہ اگر ملزم کو سزائے موت دی جائے تو جج کبھی کبھی سیاہ رنگ کی چوڑی پہن لیتے ہیں —— بہرحال آپ اپنا بیان جاری رکھیے ——"

" یہ صدمہ میرے لیے ناقابلِ برداشت تھا اور قریب تھا کہ مَیں بے ہوش ہو جاؤں، مگر مَیں نے اپنے آپ کو سنبھالا اور ملازموں کو بُلانے کے لیے برقی گھنٹی بجائی۔ پھر اتنا یاد ہے کہ کمرہ گھر کے ملازموں، خادماؤں اور نہ جانے کن کن افراد سے بھر گیا تھا —— خادمائیں اور بیرے بے اختیار چیخنے چلّانے اور رونے لگے، پھر انھوں نے والد کو فرش سے اُٹھا کر صوفے پر لِٹا دیا۔ وہ بالکل بے ہوش تھے۔ ہماری ہاؤس کیپر مسز گرانٹ نہایت ہوشیار خاتون ہیں۔ انہوں نے ڈاکٹر کے آنے سے پہلے والد کے ہاتھ پر پٹّی باندھی تاکہ اور خون نہ بہے۔ وہ زخم خاصا گہرا تھا اور کسی چاقو یا چھُری کا معلوم نہ ہوتا تھا۔ مَیں نے اُسی وقت ڈاکٹر اور پولیس کو بُلانے کے لیے آدمی دوڑا دیے۔ میرا ذہن کسی حد تک ماؤف ہو چکا تھا اور کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ کیا ہو گیا اور اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔ پھر یکایک آپ کا خیال آیا اور مَیں نے خط لکھ کر اپنے کوچبان کو آپ کے پاس بھیجا —— اِس حادثے کے پندرہ بیس منٹ بعد ڈاکٹر ونچسٹر یہاں آ گئے اور جلدی جلدی والد کے ہاتھ کی ڈریسنگ کی۔ اب وہ چند ضروری انجکشن اور دوائیں لینے گئے ہیں۔ غالباً اب آتے ہی ہوں گے۔"

مِس ٹریلانی نے ان الفاظ کے ساتھ اپنا بیان ختم کر دیا۔ کمرے میں چند منٹ تک خاموشی چھائی رہی۔ پھر مَیں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور دروازہ کھول کر باہر ہال میں آیا۔ سپرنٹنڈنٹ ڈولین بے چینی سے اِدھر اُدھر ٹہل رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ تیر کی طرح میرے پاس آیا اور کہنے لگا :

" یہ نہایت پُراسرار اور ناقابلِ فہم واردات ہے جناب۔ میں نے ہر چیز کا بغور معائنہ کیا ہے، مگر ابھی تک یہ گتھی سلجھانے سے قاصر ہوں۔ بہرحال جلد یا بدیر یہ

معاملہ روشنی میں آ جائے گا۔ مَیں نے سکاٹ لینڈ یارڈ کو پیغام بھیج دیا ہے کہ جلد از جلد کسی ماہر سراغ رساں کو میری مدد کے لیے روانہ کرے۔ مَیں نے یارڈ سے درخواست کی ہے کہ اگر ممکن ہو تو سرجنٹ ڈاؤ کو بھیج دیں۔ وہ نہایت ہوشیار اور تجربے کار آدمی ہے۔ آپ کو ہوکسٹن کا وہ کیس تو یاد ہو گا جس میں مجرم نے زہر دے کر اپنی بیوی کو ہلاک کر دیا تھا اور معاملہ بے حد پُراسرار تھا، مگر سرجنٹ ڈاؤ نے منٹوں میں حل کر دیا۔"

" ہاں ہاں مجھے خُوب یاد ہے۔ آپ نے بہت اچّھا کیا کہ سرجنٹ کو طلب کر لیا۔ وہ بلاشبہ ذہین آدمی ہے۔ مجھے یقین ہے اس کی آمد ہمارے لیے قیمتی ثابت ہو گی۔"

دفعتہً صدر دروازے کی گھنٹی زور سے چیخ اُٹھی۔ خادم نے دروازہ کھولا اور ادھیڑ عمر کا ایک طویل قامت شخص صاف ستھرا لباس پہنے اور نفیس چمڑے کا سیاہ بیگ ہاتھ میں سنبھالے نمودار ہوا۔ اس کا بڑا سر بالوں سے بے نیاز تھا اور چوڑی بلند پیشانی پر غور و فکر کی گہری لکیریں پھیلی ہوئی تھیں۔ مِس ٹریلانی نے دو قدم بڑھ کر اس کا استقبال کیا۔ پھر نووارد کو ہم سے متعارف کراتے ہوئے کہا :

"آپ ہیں ڈاکٹر ونچسٹر . . . مسٹر مالکم روز . . . . سپرنٹنڈنٹ ڈولین . . ."

اس نے اَدب سے مصافحہ کیا اور کہا کہ اُسے فوراً مسٹر ٹریلانی کے کمرے میں لے جایا جائے ؛ چنانچہ ہم سب بھی اس کے ساتھ چلے۔ ڈاکٹر ونچسٹر نے جلد جلد سرنج میں دَوا بھری اور بے ہوش پڑے ہوئے مسٹر ٹریلانی کے بازو میں سوئی گھونپ دی۔ پھر اُس نے پٹّی کھول کر زخم کا دوبارہ معائنہ کیا۔ سفید رنگ کا کوئی سفوف زخم پر چھڑکا اور پٹّی دوبارہ باندھ دی۔ اس دوران میں وہ ڈولین سے بھی زخم کے بارے میں کچھ کہتا جاتا تھا اور پولیس افسر اپنی عادت کے مطابق ہر بات نوٹ بُک میں دَرج کر رہا تھا۔

" ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ زخم کسی نہایت تیز دھار اور نوکیلے اوزار کے ذریعے لگائے گئے ہیں۔ گوشت کے ریشے اِس صفائی سے کٹے ہیں کہ مجھے حیرت ہوتی ہے۔"
پھر اس نے مِس ٹریلانی کی طرف مڑ کر کہا :

" اگر آپ اجازت دیں تو میں اِن کے ہاتھ سے یہ چُوڑی اتار لُوں ؟ میرا خیال

ہے اس کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے۔ ہاتھ میں پڑی رہنے کے باعث یہ زخم کو نقصان پہنچا سکتی ہے۔"

مِس ٹریلانی نے غم گین لہجے میں جواب دیا:

"ڈاکٹر ونچسٹر، میں آپ پر پُورا اعتماد کرتی ہوں۔ جو جی چاہے کیجیے، لیکن اِتنی درخواست ضرور کروں گی کہ میرے والد غیر معمولی آدمی ہیں اور ان کا کوئی کام بھی بے معنی نہیں ہوتا۔ یقیناً اُنھوں نے یہ چوڑی کسی خاص مقصد کی تکمیل کے لیے پہنی ہوگی۔ آپ کہتے ہیں کہ یہ زخموں کو نقصان پہنچا سکتی ہے، اس لیے اسے الگ کرنا ضروری ہے۔ بہر حال آپ ہر کام سوچ سمجھ کر کیجیے۔"

مَیں نے اور سپرنٹنڈنٹ ڈولین نے اِس بات کی تائید کی۔ ڈاکٹر ونچسٹر نے کچھ سوچتے ہوئے گردن ہلائی۔ پھر کہنے لگا:

"مَیں معافی چاہتا ہوں۔ اِس رُخ پر میں نے غور کیا ہی نہ تھا۔ مَیں مِسٹر ٹریلانی کی عادتوں سے بخوبی واقف ہوں۔ بلاشبہ وہ کوئی کام بِلا مقصد نہیں کرتے۔ ضرور اس چوڑی کا کوئی نہ کوئی فائدہ ان کے پیشِ نظر رہا ہوگا۔" یہ کہہ کر وہ جُھکا اور چوڑی کو غور سے دیکھنے لگا۔ پھر اس کے چہرے پر حیرت اور خوف کے مِلے جُلے اثرات نمودار ہوتے۔ اس نے کوٹ کی اندرونی جیب میں سے محدّب شیشہ نکالا اور اب اس کی مدد سے چوڑی کا معائنہ کرنے لگا۔ چند لمحے بعد اس نے اس نے شیشہ ڈولین کی طرف بڑھایا اور کہا:

"میری تو عقل کام نہیں کرتی ــــ آپ بھی اِسے دیکھیے۔ یہ چوڑی خالص سونے کی بنی ہوئی ہے اور اِس پر نہایت عجیب نقش و نگار اور تصویریں سی بنی ہیں۔ کام اِتنا نازک اور نفیس ہے کہ پُورے اِنگلستان میں اِس فن کو جاننے والا مشکل سے ملے گا۔ اِس چوڑی کو کھولنے کے لیے اسی کے اندر ایک ننھی سی چابی بھی لگی ہے، مگر مَیں دیکھتا ہوں کہ یہ کام میرے یا آپ کے بس کا نہیں ہے۔ چوڑی آسانی سے نہ اُترے گی ــــ"

ڈولین نے بھی شیشے کے ذریعے چوڑی کا معائنہ کیا۔ پھر اس نے شیشہ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا:

"مجھے ڈاکٹر ونچسٹر کی رائے سے پورا اتفاق ہے۔ یہ معمولی چُوڑی نہیں۔ بے حد قیمتی ہے اور یقیناً اسے کلائی سے اتارنا ممکن نہیں ــــ آپ بھی دیکھیے اور مِس ٹریلانی کو بھی دِکھائیے۔"

مَیں تو اس چوڑی کو دیکھنے میں مصروف ہوگیا اور ڈولین نے یہ تمام تفصیلات اپنی نوٹ بک میں درج کرلیں۔ یکایک میں نے مِس ٹریلانی کے رونے کی آواز سُنی۔ وہ ہاتھوں سے اپنا حسین چہرہ ڈھانپ کر سِسکیاں لے رہی تھی۔ مَیں نے اسے صوفے پر بِٹھا دیا اور تسلّی دینے لگا، مگر اس کا غم بے پناہ تھا۔ معصوم لڑکی اتنی شدید آفت کا مقابلہ کرتے ہوئے خوف زدہ تھی۔ اُسے اپنے باپ کے بارے میں کچھ بھی تو نہیں معلوم تھا۔ اور اب وہ اُپنے آپ کو ایک نئی فضا میں گِھرا ہوا پا رہی تھی۔

سپرنٹنڈنٹ ڈولین نے میرے کان میں کہا:

"جنابِ والا، میرا خیال ہے کہ۔۔۔"

اس نے جملہ پورا ادا نہ کیا تھا کہ دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی اور ہم یُوں چونک پڑے جیسے گہری نیند سے جاگے ہوں۔

پُراَسرار لفافہ

ڈڈلین نے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ اس کی چال ڈھال اور گفتگو سے یہ اندازہ کچھ مشکل نہ تھا کہ وہ اپنے آپ کو ہر طرح ایک ذمّہ دار اور چاق چوبند پولیس افسر ظاہر کر رہا ہے اور ہم سب گویا اس کی ماتحتی میں دے دِیے گئے ہیں۔ دروازے میں کھڑے کھڑے اس نے آنے والے سے سرگوشی کی، پھر اُسے لے کر کمرے میں آیا۔ نووارد دُبلے پتلے جسم کا ایک لمبا نوجوان تھا۔ ڈاڑھی مونچھیں صاف، طوطے کی چونچ کی سی مڑی ہوئی ناک، اپنی چمکدار نیلی آنکھوں سے نووارد نے ایک لمحے ہی میں کمرے کا اچھی طرح جائزہ لے لیا۔ پھر اُس نے اِستفہامیہ انداز میں میری اور ڈاکٹر ونچسٹر کی طرف دیکھا۔ ڈڈلین نے گہرا سانس لیا اور کہا :

"یہ ہیں جناب، سرجنٹ ڈاؤ ——"

تب میں نے اُسے پہچانا۔ بلاشبہ وہ بہت بدل گیا تھا۔ اُس نے جُھک کر ہم سب سے مصافحہ کیا، پھر ہاتھ مَلتے ہوئے بولا :

"مجھے افسوس ہے۔ . . بے حد افسوس . . . اِس تکلیف دہ حادثے پر . . . مَیں مسٹر ٹریلانی کو اچھی طرح جانتا ہوں . . . ایسا عالم فاضل آدمی پورے ملک میں کوئی نہیں ہے۔ نہایت عظیم شخصیت . . . اس کا بھلا کون دشمن ہو سکتا ہے۔ ضرور یہ کسی چور اُچکّے کی حرکت ہے . . . مسٹر ٹریلانی نے اس مکان میں بے پناہ قیمتی اشیاء سجا

رکھی ہیں . . . یقیناً یہ بدمعاشوں اور اُٹھائی گیروں کا کارنامہ ہے . . ."

پھر اُس نے مسٹر ٹریلانی کا سر سے پَیر تک بغور جائزہ لیا۔ کمرے میں گھوم پھر کر ہر چیز کو دیکھا۔ اس کے ہونٹ سختی سے بھینچے ہوئے تھے اور چہرے کی رنگت بار بار بدل رہی تھی۔ یک لخت وہ میری طرف مڑا اور کہنے لگا :

"کہیئے جناب، آپ کے مزاج کیسے ہیں ؟ یقیناً آپ مجھے بھولے نہ ہونگے۔ وہ ہوسٹن والا کیس . . . ؟"

"بے شک، بے شک —— مجھے یاد ہے۔" مَیں نے دوبارہ مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ سپرنٹنڈنٹ ڈڈلین کو غالباً سرجنٹ کی یہ بے تکلّفی پسند نہ آئی۔ اُس نے خشک لہجے میں کہا :

"میرا خیال ہے پُرانی باتوں میں وقت ضائع کرنا مناسب نہ ہوگا۔ میں چاہتا ہوں کہ تم جلد از جلد اِس کیس کو اپنے ہاتھ میں لے لو اور اپنی تفتیش پایۂ تکمیل تک پہنچا کر مُجرم کو قانون کے حوالے کرو۔ مجھے تمہاری صلاحیتوں پر کُلّی اعتماد ہے۔ مسٹر مالکم رُوز بھی یقیناً تمہارے ساتھ تعاون کریں گے اور جہاں تک میری ضرورت کا تعلق ہے، تم مجھے ہر وقت مستعد پاؤ گے۔ اب میں پولیس اسٹیشن جاتا ہوں۔ اگر کِسی اور آدمی کی ضرورت ہو تو بتاؤ ؟"

"اگر ممکن ہو تو جونی رائٹ کو یہاں بھجوا دیجئے گا۔ اس کی موجودگی میں میرے دماغ کی کھڑکیاں کھُلی رہتی ہیں۔" سرجنٹ ڈاؤ نے مسکرا کر کہا۔

"بہت بہتر —— مَیں اُسے جاتے ہی بھجوا دوں گا، بشرطیکہ وہ اِس وقت ڈیوٹی پر موجود ہوا۔"

سپرنٹنڈنٹ ڈڈلین کو رخصت کر کے سرجنٹ ڈاؤ نے اطمینان کا سانس لیا اور مجھ سے کہنے لگا :

"آپ تو انہیں جانتے ہی ہیں . . . کاش یہ شخص اتنا موٹا نہ ہوتا . . ."

اب وہ ڈاکٹر ونچسٹر کی طرف متوجہ ہُوا۔ اُس کا نام اور پتہ اپنی ڈائری میں

درج کرنے کے بعد سارجنٹ نے کہا:

"میری رائے میں آپ اس کیس کی ایک مکمّل رپورٹ تیار کر کے مجھے دے دیں تاکہ ضرورت پڑے تو مَیں یہ رپورٹ پولیس ہیڈکوارٹر بھجوا دوں۔"

"بہت بہتر۔" ونچسٹر نے کہا اور اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ اب سارجنٹ نے باری باری میری اور مس ٹریلانی کی طرف دیکھا:

"دیکھیے، مَیں آپ لوگوں کو کسی قسم کی مزید پریشانی میں مبتلا نہیں کرنا چاہتا۔ اس کیس کو حل کرنے کا بہتر طریقہ یہ ہوگا کہ ہم ایک دوسرے سے تعاون کریں اور اپنی رائے کسی جھجک کے بغیر دوسروں کو بتا دیں۔ مَیں پہلے مس ٹریلانی سے درخواست کروں گا کہ وہ اپنے والد کے بارے میں تفصیل سے مجھے بتائیں — کسی بات کو معمولی سمجھ کر نظر انداز نہ کیجیے گا، ممکن ہے آپ کے نزدیک وہ بات غیر اہم ہو اور میرے نزدیک انتہائی اہم۔"

"مجھے افسوس ہے کہ مَیں کچھ زیادہ نہ بتا سکوں گی۔" مارگریٹ ٹریلانی نے رُک رُک کر کہنا شروع کیا۔ "مجھے والد کے مشاغل کے بارے میں نہایت کم باتیں معلوم ہیں اور وہ سب مَیں سپرنٹنڈنٹ ڈولین اور مسٹر مالکم رُوز کو بتا چکی ہوں۔"

"بہت خوب ... بہت خوب۔ آپکی نہایت مہربانی ہوگی اگر وہی باتیں مجھے بھی بتا دی جائیں۔ دیکھیے، اس طرح ہم بہت جلد کسی نتیجے پر پہنچ سکیں گے۔"

اس موقع پر مَیں نے کچھ کہنے کی کوشش کی، لیکن مارگریٹ نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے منع کیا اور وہ تمام واقعہ تفصیل سے سارجنٹ کو سُنا دیا جو تھوڑی دیر پہلے اس عمارت میں پیش آیا تھا۔ جب تک وہ بولتی رہی، سارجنٹ اپنی جگہ بے حس و حرکت کھڑا رہا اور جب اس کا بیان ختم ہو گیا تو سارجنٹ نے سوالات شروع کیے۔

"مَیں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں مس ٹریلانی اور اب مَیں آپ کی اجازت سے اس کمرے کا معائنہ کرنا چاہتا ہوں، مگر یہ تو فرمائیے کہ جب آپ نے اپنے والد کے کمرے کے باہر کھڑی تھیں، تب آپ نے وہ پُراسرار آواز سنی تھی یا آپ

اپنے کمرے میں تھیں؟"

"مَیں اُس وقت اپنے کمرے میں تھی۔ جیسا کہ مَیں کہہ چکی ہوں، صبح صادق ہونے ہی والی تھی کہ یہ آواز میرے کانوں میں آئی۔ مَیں غنودگی کے عالم میں تھی اور یہ آواز سن کر چونک گئی۔ چند لمحوں بعد مَیں نے یہی آواز دوبارہ سُنی۔ مَیں فوراً اپنے کمرے سے نکلی اور والد کے کمرے کی طرف آئی۔ مَیں نے دیکھا کہ اُن کے کمرے کا دروازہ بند ہے۔ کوئی شخص بھی نہ وہاں داخل ہو سکتا تھا اور نہ وہاں ایسے آثار تھے جن سے ظاہر ہوتا کہ کوئی ان کے کمرے کے قریب آیا ہے، اور نہ مَیں نے کسی کو دیکھا۔"

سارجنٹ نے اثبات میں کئی بار گردن ہلائی۔ پھر وہ مسٹر ٹریلانی کے بستر کی طرف گیا اور احتیاط سے اس کا معائنہ کیا۔

"کیا واردات کے بعد اس بستر کو کسی نے چھیڑا ہے؟ میرا مطلب ہے کوئی چادر وادر یا تکیہ تو یہاں سے نہیں ہٹایا گیا؟"

"میرے علم کے مطابق تو ایسا نہیں ہُوا" مارگریٹ نے جواب دیا۔ "تاہم ہاؤس کیپر مسز گرانٹ سے بھی پوچھ لیا جائے تو اچھّا ہے۔"

اُس نے دیوار میں لگا ہوا ایک بٹن دبایا۔ دو منٹ بعد دروازہ آہستہ سے کھُلا اور مسز گرانٹ کا بوڑھا، لیکن باوقار چہرہ نمودار ہُوا۔

"آئیے، مسز گرانٹ ... ذرا ان صاحب کو یہ بتا دیجیے کہ واردات کے بعد کسی نے والد کا بستر تو نہیں چھُوا۔" مس ٹریلانی نے سارجنٹ سے کہا۔ "واردات کے بعد مَیں اور مسز گرانٹ ایک لمحے کے لیے بھی اس کمرے سے باہر نہیں گئے۔ نوکروں اور خادماؤں میں سے کوئی بھی بستر کے نزدیک نہیں گیا۔ خطرے کا الارم سننے کے بعد وہ سب کے سب دوڑے ہوئے آئے تھے۔ لیکن کسی کو بھی والد کے بستر کے قریب جانے کی ہمت نہ ہوئی اور جیسا کہ مَیں نے ابھی آپ کو بتایا، والد اُس آہنی سیف کے پاس بے ہوش پڑے تھے، لہٰذا سبھی کی توجّہ والد پر تھی، اُن کے بستر پر

کسی نے دھیان نہ دیا۔ اس کے فوراً بعد ہی میں نے سب کو وہاں سے چلے جانے کا حکم دیا تھا۔"

سارجنٹ نے محدّب شیشے کے ذریعے بستر کا بغور معائنہ شروع کیا۔ وہ بڑی احتیاط سے چادر کو چھوتا اور تکیے کو جہاں سے اُٹھاتا وہیں رکھتا۔ پھر اس نے مسہری کے ساتھ ہی ایک بند دروازے کو دیکھا اور آہستہ آہستہ آہنی سیف کے قریب جا پہنچا۔ یہاں خون بڑی مقدار میں بکھرا ہُوا تھا۔ سارجنٹ نے سیف کے اگلے حصّے کا ایک ایک اِنچ غور سے دیکھا، مگر کوئی خاص بات دریافت نہ ہوئی۔ یہاں سے فارغ ہو کر وہ کھڑکیوں کی طرف گیا اور ان کا معائنہ کیا۔ تمام کھڑکیاں اندر کی طرف سے بند تھیں۔

"مس ٹریلانی، جب آپ آواز سننے کے بعد اس کمرے میں داخل ہوئیں، کیا جب بھی یہ کھڑکیاں اندر سے بند تھیں؟"

"جی ہاں ـــــ مَیں نے کبھی اِن کھڑکیوں کو کھُلے ہوئے نہیں پایا۔ والد ہمیشہ انہیں بند رکھتے تھے۔"

ڈاکٹر ونچسٹر اپنی رپورٹ مکمل کر چکا تھا اور نہایت دِل چسپی سے سرجنٹ ڈاؤ کا طریقۂ تفتیش دیکھ رہا تھا۔ اِس دوران میں اس نے کئی مرتبہ بے ہوش پڑے ہوئے مسٹر ٹریلانی پر بھی توجہ دی۔ ان کی نبض دیکھی، سر اور گلے کا معائنہ کیا۔ اُن کے سینے پر کان لگا کر دل کی دھڑکن بھی سُنی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اُن کی اس مُسلسل بے ہوشی کا راز جاننے کی فکر میں ہے۔ یکایک سارجنٹ نے ڈاکٹر ونچسٹر کی طرف متوجہ ہو کر کہنا شروع کیا:

" صاحب، بات یہ ہے کہ معاملہ بے حد اہم اور ناقابلِ فہم معلوم ہوتا ہے جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں، کچھ یُوں ہے کہ کوئی نامعلوم شخص اس سیف کو کھولنے کی کوشش میں تھا کہ مسٹر ٹریلانی جاگ اُٹھے اور حملہ آور اُنہیں شدید زخمی کر کے بھاگ

گیا۔ مَیں نے سیف کے قفل کو بھی دیکھا ہے۔ اس پر سات حروف کھُدے ہوئے ہیں اور غالباً اِنہی کی خاص ترتیب کے بعد یہ قفل کھُلتا یا بند ہوتا ہے یا شاید اِس ترتیب کے بغیر بھی اسے بند کرنے کا کوئی اور طریقہ ہو۔ بہرحال میں نے دیکھ لیا ہے کہ یہ چاٹ وُڈ کمپنی کا بنا ہُوا ہے۔ میں ان لوگوں سے معلوم کروں گا۔ خیر، یہ تو بعد کی باتیں ہیں، ڈاکٹر صاحب، کوئی ایسی بات جو آپ مجھے بتانا چاہتے ہوں۔۔؟ اس رپورٹ کے علاوہ؟"

ڈاکٹر ونچسٹر نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور کہا:

"میرے پاس آپ کو بتانے کے لیے کوئی خاص بات نہیں، مریض کی کیفیت اور جو کچھ میں نے اس کمرے میں دیکھا، وہ سب اپنی رپورٹ میں لکھ چکا ہوں؛ تاہم مجھے حیرت اس بات پر ہے کہ مسٹر ٹریلانی کے سر پر زخم کا ہلکا سا نشان بھی نہیں اور نہ اندرونی طور پر کوئی دماغی ضرب لگی ہے، پھر وہ اتنی دیر سے بے ہوش کیوں ہیں۔ اس سوال کا جواب یہی ممکن ہے کہ یا تو انہیں کوئی نشہ آور چیز دی گئی ہے یا ہپناٹائز کیا گیا ہے۔ جہاں تک کسی نشہ آور چیز کا تعلق ہے، مَیں اس کا اطمینان بھی کر چکا ہوں ایسی کوئی شے مسٹر ٹریلانی کو نہیں دی گئی۔ کم از کم ایسی شے جس کا علم مجھے ہو سکتا ہے۔ تقریباً تمام نشہ آور دواؤں سے مَیں خوب واقف ہوں۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ اس کمرے میں حنوط کی گئی لاشوں کی ایسی تیز بُو پھیلی ہوئی ہے کہ اس کی موجودگی میں کسی اور بُو کا سُراغ لگانا ممکن نہیں۔ ہو سکتا ہے مسٹر ٹریلانی نے خود کوئی ایسی چیز کھا لی ہو اور اتفاقیہ طور پر خود کو زخمی کر لیا ہو۔ مَیں دیکھتا ہوں اس کمرے میں خود کو زخمی کر لینے کا خاصا سامان موجود ہے۔"

اُس نے دیواروں پر لگے ہوئے پُرانے خنجروں اور چاقوؤں کی طرف اشارہ کیا۔ سارجنٹ ڈاؤ نے نفی میں سر کو جنبش دیتے ہوئے کہا:

"مگر سوال تو یہ ہے کہ جس چھُرے یا چاقو سے مسٹر ٹریلانی زخمی ہوئے ہیں، وہ کہاں ہے؟ مجھے ایسی کوئی چیز دکھائی نہیں دی۔ بہرحال یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہے۔"

"جی ہاں ۔" ڈاکٹر ونچسٹر نے اپنی عینک کو ناک پر جماتے ہوئے کہا۔ "خواہ مسٹر ٹریلانی نے اپنے آپ کو زخمی کیا ہو یا باہر سے آنے والے کسی شخص نے، کوئی ہتھیار ضرور استعمال کیا گیا ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ زخمی ہونے کے بعد وہ ہتھیار مسٹر ٹریلانی نے خود اِس آہنی سیف میں بند کر دیا ہو؟"

سارجنٹ کے لبوں پر ہلکا سا تبسّم نمودار ہوا۔ اس نے کہا:

"نہیں جناب، ایسا نہیں ہو سکتا۔ آپ دیکھتے ہیں کہ مسٹر ٹریلانی کا بایاں ہاتھ خون میں لت پت ہے مگر سیف پر خون کا ہلکا سا دھبّا بھی موجود نہیں۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں سارجنٹ ۔" مَیں نے بھی پہلی بار زبان کھولی اور دیکھا کہ میری اس تائید پر سارجنٹ کا چہرہ خوشی سے چمکنے لگا۔ کمرے میں دیر تک خاموشی طاری رہی۔ ہر فرد کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ آخر ڈاکٹر کی آواز نے یہ سنّاٹا توڑا۔ وہ کہہ رہا تھا:

"جتنی جلد ممکن ہو، مسٹر ٹریلانی کی نگرانی کے لیے کسی تجربے کار اور ہوشیار نرس کا انتظام ہونا چاہیے۔ اگر مس ٹریلانی اجازت دیں تو مَیں خود نرس کا انتظام کر دوں گا۔ مَیں خود اُسے لینے جاتا ہوں۔ اِس دوران میں میری درخواست ہے کہ کوئی صاحب یہاں موجود رہیں۔ مریض کو ایک ثانیے کے لیے بھی تنہا نہ چھوڑا جائے اور میرا مشورہ یہ ہے کہ نرس کے آ جانے کے بعد مریض کو کسی دوسرے کمرے میں منتقل کر دیا جائے۔ اِس کمرے کی فضا مریض کے لیے مناسب نہیں ہے۔ مس ٹریلانی، کیا آپ یا مسز گرانٹ مریض کے پاس موجود رہیں گی؟ کم از کم میری واپسی تک؟"

"بے شک، مَیں یہاں سے نہ جاؤں گی۔" مارگریٹ نے جواب دیا اور بڑھ کر اُس صوفے کے ایک کونے پر جا بیٹھی جس صوفے پر اس کا باپ بے ہوشی کے عالم میں پڑا تھا۔ اگر اس دوران میں مسٹر ٹریلانی ہوش میں آ جائیں تو کیا تدابیر اختیار کی جائیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر نے چند ضروری ہدایات بھی دیں۔ اس کے بعد وہ رخصت ہو گیا۔

سارجنٹ ڈاؤ نے کہا:

"اب مجھے بھی مصروف ہو جانا چاہیے۔ سب سے پہلے مَیں یہ سیف اور قفل بنانے والی کمپنی کے دفتر میں جاؤں گا اور اُن سے قفل کھولنے کا راز معلوم کروں گا۔ اس کے بعد سکاٹ لینڈ یارڈ جا کر اپنے چیف کو پُوری رپورٹ دُوں گا اور پھر یہاں آ جاؤں گا۔ میرا خیال ہے مجھے زیادہ دیر تک باہر نہ رہنا پڑے گا۔ میں مسٹر مالکم رُوز سے درخواست کروں گا کہ اگر اُنہیں کوئی خاص مصروفیت نہ ہو تو وہ میری واپسی تک یہیں ٹھہریں۔"

"مَیں اپنی سب مصروفیات ترک کر کے آیا ہوں۔" مَیں نے جواب دیا۔ "اگرچہ آج ایک مقدّمے کی تاریخ ہے، تاہم میرا نائب اُسے بخوبی بھگت لے گا۔"

مس ٹریلانی کی آنکھوں سے تشکّر کے بے پناہ جذبات جھلکنے لگے۔ سارجنٹ نے کہا:

"جانے سے پہلے چاہتا ہوں کہ اس کمرے کی بعض چیزوں کو دیکھ بھال لُوں بشرطیکہ مس ٹریلانی مجھے اجازت دے دیں۔ خاص طور پر میں آپ کے والد کی میز اور اس میز کی درازیں دیکھنے کا خواہش مند ہوں۔ ممکن ہے یہاں سے کوئی ایسی چیز مل جائے جو ہمیں اس انوکھی واردات کا سراغ لگانے میں مدد دے سکے۔"

مارگریٹ نے نرم لہجے میں کہا:

"سارجنٹ، مَیں تم پر پُورا اعتماد کرتے ہوئے بخوشی اجازت دیتی ہوں کہ جس طرح چاہو، کرو۔ مَیں تو صرف یہ چاہتی ہوں کہ والد جس آفت سے دوچار ہیں، وہ آفت ٹل جائے اور کسی طرح اُن کی جان بچے۔"

"شکریہ ... بہت بہت شکریہ۔" "میں آپ کے اعتماد کو ٹھیس نہ پہنچاؤں گا" سارجنٹ نے اُدب سے گردن جھکا کر جواب دیا اور سب سے پہلے ڈریسنگ ٹیبل کی طرف گیا۔ اس کی درازیں تقریباً خالی پڑی تھیں اور ان میں کوئی قابلِ ذکر چیز نہ تھی۔ پھر اس نے رائٹنگ ٹیبل کی تلاشی لینی شروع کی۔ یہاں سے کاغذات برآمد ہوئے۔ دفعتہً اُس کے مُنہ سے ہلکی سی چیخ نکلی اور ہم چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔ زرد رنگ کا ایک موٹا سا لفافہ اس کے ہاتھ میں تھا جس کے اُوپر لاکھ کی مہریں

لگی تھیں۔ سارجنٹ نے یہ لفافہ مارگریٹ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا:

"یہ غالباً آپ کے والد کا خط آپ کے نام ہے۔"

مارگریٹ نے کانپتے ہاتھوں سے لفافہ تھام لیا اور غور سے دیکھا۔

"واقعی یہ اُنہی کی تحریر ہے .... مَیں بخوبی پہچانتی ہوں ..." اس کے چہرے کا رنگ ہر آن متغیّر ہو رہا تھا۔ پھر اس نے مُہریں توڑ کر جلدی سے لفافہ چاک کیا اور ایک لمبا سفید کاغذ نکال کر پڑھنا شروع کر دیا۔ سارجنٹ ٹکٹکی باندھے مارگریٹ کو تک رہا تھا۔ غالباً وہ اس کے چہرے کے تاثّرات سے یہ بھانپنے کی کوشش کر رہا تھا کہ خط کا مضمون کیا ہے۔

چند منٹ اِسی طرح گزر گئے۔ مارگریٹ نے اس دوران میں کئی بار خط پڑھا اور ہم دونوں آدمیوں کی موجودگی سے بالکل بے خبر ہو کر کسی گہری سوچ میں گم ہو گئی۔ اس کی آنکھیں فرش پر گڑی تھیں اور جسم بے حس و حرکت تھا۔ یکایک جیسے وہ ہوش میں آ گئی اور کچھ کہے بغیر اُس نے وہ خط سارجنٹ کی طرف بڑھا دیا۔ اب سارجنٹ پر وہی کیفیت طاری ہو گئی جو تھوڑی دیر پہلے مارگریٹ پر طاری تھی۔ مَیں دیکھ رہا تھا کہ سارجنٹ گرد و پیش سے بے خبر خط میں کھو چکا ہے۔ اس کے ہونٹ سختی سے بھنچے ہُوئے تھے اور آنکھیں تارا بی خط پر گڑی تھیں۔ مَیں نے مارگریٹ کی جانب دیکھا۔ وہ بھی مُجھے دیکھ رہی تھی۔ نِگاہیں چار ہوتے ہی اس نے گردن جُھکا لی اور شرم سے اس کا حسین اور دل کش چہرہ گُلنار ہو گیا۔ میرا دل بُری طرح دھڑکنے لگا اور پیشانی پر پسینے کے قطرے اُبھر آئے۔ اِتنے میں سارجنٹ کی آواز کمرے میں گونجی:

"مِس ٹریلانی، مَیں نے یہ خط غور سے پڑھا ہے۔ کیا آپ کو پورا یقین ہے کہ یہ تحریر آپ کے والد ہی کی ہے؟ اس میں کہیں شک و شبہے کی گنجائش تو نہیں؟"

"مَیں پُورے یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ تحریر اُنہی کے قلم کی ہے اور لفافے پر جو مُہریں لگی ہیں، وہ بھی میرے والد کی ہیں۔"

سارجنٹ نے معنی خیز انداز میں گردن کو جھٹکا دیا اور خط میری طرف بڑھا دیا۔

سفید کاغذ پر بڑے بڑے حروف میں نیلی روشنائی سے یہ خط لکھا گیا تھا۔ خط کا انداز اور حروف کی نشست بتاتی تھی کہ لکھنے والا مضبوط قوتِ ارادی کا مالک ایک غیر معمولی شخص ہے۔ مَیں یہاں لفظ بہ لفظ اس خط کی نقل پیش کرتا ہوں:

"میری پیاری بیٹی!

مَیں چاہتا ہوں اِس خط میں جو ہدایات درج ہیں، اُن پر تم سختی سے عمل کرو۔ اس میں میرا بھی بھلا ہے، تمہارا بھی — کسی بھی وقت اگر مجھ پر بیماری یا غشی کا غلبہ ہو، مجُھ پر قاتلانہ حملہ کیا جائے یا کوئی حادثہ رونما ہو، ہر صورت میں، خواہ مَیں مَر جاؤں یا زندہ رہوں، مجُھے میری خواب گاہ میں پہنچا دیا جائے۔ اگر حادثہ میری خواب گاہ سے باہر کسی دوسری جگہ پیش آئے تب بھی مجُھے فوراً خواب گاہ میں لایا جائے۔ یہ نہایت ضروری ہے۔ اگر مَیں مَر جاؤں تو دفن کیے جانے تک میری لاش کی دن رات نگہبانی کی جائے اور ایک لمحے کے لیے بھی مجُھے تنہا نہ چھوڑا جائے۔ سُورج غروب ہونے سے طلوعِ سحر تک میری سختی سے نگہداشت کی جائے۔ اِس مقصد کے لیے کم از کم دو افراد کا میری خواب گاہ میں چوبیس گھنٹے حاضر رہنا نہایت ضروری ہے۔ اس ہدایت کو خوب یاد رکھنا اور یہ دونوں افراد تمہارے قابلِ اعتماد دوست ہوں۔ ان میں سے ایک مرد اور ایک عورت ہو۔ دونوں ایک ہی جنس کے ہرگز نہ ہوں۔ اِس دوران میں مجُھے ہوش آیا تو مزید ہدایات زبانی دوں گا اور اگر مر گیا تو میرے قانونی مشیر مارون اینڈ جیوکس، ۲۷ بی لنکن اِن، لندن میرے وصیت نامے کے مطابق کارروائی کریں گے۔

میری عزیز بیٹی، میرے سوا دنیا میں تمہارا کوئی نہیں۔ تمہیں چاہیئے کہ اپنے کسی قابلِ اعتماد دوست کو، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، ضرورت کے وقت فوراً بلُوا لینا اور یہ دوست ایسا ہو کہ میری خواب گاہ میں بیٹھ

کررات کو میری نگہبانی بھی کر سکے (حادثے کی صورت میں) پیاری بیٹی، دنیا بڑی عجیب جگہ ہے۔ یہاں قدم قدم پر مصیبتیں، آفتیں، خطرے اور آلائشیں منہ پھاڑے کھڑی ہیں۔ تمہیں ان سے بچ کر چلنا ہوگا۔ مجھ پر جو کچھ بیتی ہے اور جو کچھ بیتے گی، اس کی خاص وجوہ ہیں۔ زندہ رہا تو سب کچھ بتا دوں گا؛ ورنہ میں نے ایسا انتظام کر دیا ہے کہ تمام باتیں تمہیں خود معلوم ہو جائیں گی۔ ایک اور خاص ہدایت یہ ہے کہ میری خواب گاہ سے کوئی شے نہ ہٹائی جائے اور نہ اس کی جگہ تبدیل ہو۔ اس ہدایت کا پورا خیال رکھنا۔ اگر میری خواب گاہ میں رکھی ہوئی چیزیں اپنی جگہ نہ رہیں یا اِدھر اُدھر کر دی گئیں تو مجھے ناقابلِ تلافی نقصان پہنچ جائے گا۔ تمہیں اس دوران میں جتنی رقم کی ضرورت پڑے، مسٹر ہارون کو بتا دینا۔ وہ تمہاری ضروریات پوری کر دیں گے۔ میں بھی انہیں تمام ضروری ہدایات دے چکا ہوں۔

خدا تمہیں ہمیشہ کے لیے خوش اور تندرست رکھے۔

تمہارا باپ

ایبل ٹریلانی"

میں نے یہ عجیب و غریب اور چکرا دینے والی تحریر دو مرتبہ پڑھی، پھر مس ٹریلانی کی طرف دیکھا۔ اُس کی نگاہیں میری طرف لگی ہوئی تھیں۔ ان نگاہوں میں جو پیغام چھپا ہوا تھا، میں اُسے بغور سمجھ رہا تھا۔ وہ یقیناً میری مدد کی طالب تھی۔ یکبارگی میرا دل زور سے دھڑکا۔ کیا میں اس سلسلے میں مس ٹریلانی کی کوئی مدد کر سکوں گا۔ وہ نہ جانے کس قسم کی اُمیدیں مجھ سے وابستہ کیے ہوئے تھی۔ ایسی اُمیدیں ــــ جنھیں پُورا کرنا شاید میرے بس میں نہ ہو۔

سرجنٹ ڈاؤ اپنی جگہ بے حس و حرکت کھڑا تھا۔ میں نے آہستہ سے وہ خط مس ٹریلانی کی طرف بڑھاتے ہُوئے کہا:

"میں ہر خدمت کے لیے حاضر ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ اِس موقعے پر میں آپ کو تنہا چھوڑنا پسند نہ کروں گا۔"

میں نے دیکھا کہ ان الفاظ نے مس ٹریلانی پر عجیب اثر کیا۔ اُس کا مرجھایا ہُوا زرد چہرہ ایک دم روشن ہو گیا، کانوں کی لَویں سُرخ ہو گئیں اور تراشیدہ حسین ہونٹ فرطِ جذبات سے کانپنے لگے۔ اس کی نگاہوں سے محبّت برسنے لگی۔ پھر وہ مدھم لہجے میں بولی:

"آہ، مسٹر مالکم رُوز ــــ میں کس زبان سے آپ کی اس نوازش کا شکریہ ادا کروں ــــ مجھے علم ہے آپ کا وقت بے حد قیمتی ہے۔ آپ کی مصروفیات نہایت اہم ہیں ۔ ۔ ۔ ۔"

"اس کے بارے میں آپ مُطلق فکر نہ کیجیے۔" میں نے کہا۔ "میرا وقت آپ سے زیادہ قیمتی نہیں ہے۔ میں اپنی مصروفیات اس طرح ترتیب دوں گا کہ میرا زیادہ سے زیادہ وقت آپ کے ساتھ گزرے ــــ میں دوپہر کو یہاں آ جایا کروں گا اور دوسرے دن صبح تک یہیں ٹھہرا کروں گا ــــ اور اگر حالات نے مجبور کیا تو میں مستقل طور پر یہیں آ جاؤں گا۔"

مس ٹریلانی کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے اور اُس نے اپنی یہ حالت چُھپانے کے لیے چہرہ دوسری طرف کر لیا۔ سرجنٹ ڈاؤ آگے بڑھا اور کہنے لگا:

"جنابِ والا، میں ذاتی طور پر آپ کا انتہائی شکر گزار ہوں۔ میں خود بھی اپنے وقت کا بڑا حصّہ اسی مکان میں گزارنا چاہتا ہوں بشرطیکہ مس ٹریلانی مجھے اس کی اجازت دے دیں ــــ مسٹر ٹریلانی کی یہ تحریر میرے نزدیک حد درجہ پُراسرار ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت اہم بھی ہے اور اب میں اس خط کے مضمون پر غور کرتا ہوں تو خیال آتا ہے کہ معاملات کی بظاہر جو نوعیت ہمارے سامنے آئی ہے، اصل میں ایسی صورت ہے نہیں ــــ میں چاہتا ہوں کہ آپ فی الحال یہیں ٹھہریں، میں تجوری بنانے والوں کے ہاں جاتا ہوں تاکہ اس کے

قفل کے بارے میں صحیح صحیح معلومات حاصل کرسکوں۔"

یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر چلا گیا۔ مس ٹریلانی نے گہرا سانس لیا اور میری اس کی نظریں چار ہوئیں۔ اب میں اس کے چہرے پر اطمینان اور سکون کی غیر معمولی جھلک آسانی سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے اپنے بے ہوش باپ کی طرف دیکھا۔ اُن کی حالت میں ابھی تک کوئی تبدیلی واقع نہ ہوئی تھی، سینے اور پسلیوں کی ہلکی سی جنبش سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ زندہ ہے۔

"مسٹر مالکم رُوز —— مَیں چند لمحوں کے لیے یہاں سے جا رہی ہُوں۔ براہِ کرم آپ والد کے قریب ٹھہریں۔"

مَیں نے اثبات میں گردن ہلائی اور وہ باہر نکل گئی۔ چند منٹ بعد دروازہ آہستہ سے کھُلا۔ سب سے پہلے مسز گرانٹ کا سنجیدہ اور باوقار چہرہ دکھائی دیا۔ اس کے پیچھے اسی مکان کی دو خادمائیں اور دو نوکر اور سب سے آخر میں مس ٹریلانی شاہانہ انداز سے کمرے میں داخل ہُوئیں۔ اُن سب کے چہروں پر افسردگی اور غم کے سائے پھیلے ہوئے تھے۔ نوکروں نے جلد جلد لوہے کا بنا ہوا ایک فولڈنگ پلنگ کمرے میں بچھایا، اس پر نرم گدّے اور چادریں ڈالیں، پھر مسٹر ٹریلانی کو ان سب نے مل جُل کر صوفے سے اُٹھایا اور آہستہ سے پلنگ پر لٹا دیا۔ مس ٹریلانی نے پلنگ کے نزدیک ایک کرسی گھسیٹ لی اور نگرانی کے لیے تیار ہو کر بیٹھ گئیں۔ خادمائیں اور ملازم ایک ایک کر کے باہر نکل گئے۔ اب میں نے پہلی بار اس کمرے کا گہری نظر سے جائزہ لیا۔ اس کمرے میں بے شمار چیزیں اتنی بھاری تعداد میں بھری پڑی تھیں کہ ان کا مکمل معائنہ کرنے کے لیے خاصا وقت درکار تھا۔ ہر شے اپنی جگہ عجوبۂ روزگار تھی اور خدا جانے کن کن صعوبتوں اور دشواریوں کے بعد انہیں حاصل کیا گیا ہو گا۔ بعض چیزیں بے حد قیمتی اور نفیس تھیں۔ انہیں ہاتھ لگاتے ہوئے بھی دل کانپتا تھا۔ زیادہ تر اشیا مصر سے لائی گئی تھیں اور ان پر قدیم تصویری رسم الخط میں نہ جانے کیا لکھا ہُوا تھا۔

تھوڑی دیر بعد میں نے باہر گلی میں گھوڑا گاڑی رُکنے کی آواز سُنی، دوسرے لمحے صدر دروازے کی گھنٹی بجی۔ چند منٹ بعد کمرے کے دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ میں نے کہا: "آئیے۔" دروازہ کھُلا اور ڈاکٹر ونچسٹر اندر داخل ہُوا۔ اس کے پیچھے نرسوں کی مخصوص سفید وردی پہنے ہوئے ایک لڑکی کھڑی تھی۔ ڈاکٹر ونچسٹر نے اطمینان کا لمبا سانس لیتے ہوئے مس ٹریلانی سے کہا:

"خدا کا شکر ہے مجھے مایوس نہیں ہونا پڑا۔ اِن سے ملیے . . . یہ نرس کینیڈی ہیں۔"

دونوں لڑکیوں نے نگاہ بھر کر ایک دوسرے کو دیکھا اور رسمی طور پر گردنوں کو ہلکی سی جنبش دی۔ ممکن ہے عام حالات میں مَیں اِس نوجوان نرس پر کوئی توجہ نہ دیتا، لیکن جن حالات سے ہمیں اس وقت گزرنا پڑ رہا تھا، اُن کی نوعیّت کچھ ایسی تھی کہ اِس مکان میں آنے والے ہر نووارد پر شک و شبے کی نظریں پڑنا لازمی تھا۔ ایک وکیل کی حیثیت سے مجھے آئے دن طرح طرح کی عورتوں اور مردوں سے ملنے کا موقع ملتا ہے اور یُوں مَیں کسی حد تک انسانی نفسیات کو سمجھنے کی کوشش بھی کرتا ہوں؛ چنانچہ مَیں نے اِسی نقطۂ نظر کے تحت نرس کینیڈی کو اُوپر سے نیچے تک بغور دیکھا، پھر میری نگاہ خود بخود مس ٹریلانی کی طرف اُٹھ گئی۔ یہ واقعہ ہے کہ دونوں لڑکیاں ایک دوسرے کی بے مثال ضد تھیں۔ مس ٹریلانی اگر حسن وجمال، وقار، سنجیدگی اور متانت کا مجسّمہ نظر آ رہی تھیں تو مس کینیڈی کا رنگ گہرا سانولا، جسم دُبلا اور لمبا اور چہرہ سُتا ہُوا تھا؛ البتہ اس کی آنکھیں بڑی بڑی اور خاصی چمکدار تھیں۔ اس نے گہری نظروں سے کمرے کا جائزہ لیا اور پھر دلچسپی اور حیرت سے ایک ایک چیز کو تکنے لگی۔ میں نے دیکھا کہ اس کی بھویں بھی نہایت سیاہ اور گھنی تھیں۔ غالباً وہ باپ کی طرف سے حبشی اور ماں کی طرف سے انگریز تھی۔ اس کے ہونٹ گہری لپ اسٹک سے مزیّن تھے اور جب وہ میری دیکھ کر مسکرائی تو اس کے چمکدار سفید دانت کچھ زیادہ ہی بھیانک نظر آئے۔ اس کے بازو خاصے لمبے اور اُنگلیاں

پتلی پتلی تھیں جن کے سروں پر ایک ایک اِنچ لمبے نوکیلے ناخن کسی خونخوار بلّی کے پنجوں کی مانند اُبھرے ہوئے تھے۔ اس کے سیاہ چہرے اور سیاہ آنکھوں کے برعکس سر کے بالوں کا رنگ گہرا سنہری تھا۔

مَیں ابھی اس عجیب و غریب نرس کے حُلیے کا جائزہ لے رہا تھا کہ ڈاکٹر ونچسٹر نے بولنا شروع کیا۔ وہ نرس کو اس کی ذمّہ داریوں سے آگاہ کر رہا تھا اور وہ گہری توجہ سے ڈاکٹر کی باتیں سُن رہی تھی۔ اس دوران میں اس نے ایک مرتبہ بھی ڈاکٹر ونچسٹر سے کوئی سوال نہ کیا، بلکہ ڈاکٹر کی ہدایات ختم ہوتے ہی مسٹر ٹریلانی کے پلنگ کی طرف بڑھی، ایک نظر بے ہوش پڑے ہوئے مریض پر ڈالی، پھر گدّے، چادر اور تکیے کا معائنہ کیا اور اطمینان سے دوسری کرسی پر بیٹھ گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس نے ان چند لمحوں میں نہ صرف اپنے فرائض کو بخوبی سمجھ بُوجھ لیا ہے، بلکہ مریض کو بھی مکمل طور پر اپنے چارج میں لے لیا ہے۔

اب چونکہ صورتِ حال کسی حد تک تسلّی بخش نظر آتی تھی؛ لہٰذا مَیں نے مس ٹریلانی سے تھوڑی دیر کی رُخصت لی اور جرمن سٹریٹ میں واقع اپنے مکان پر آیا۔ اس خیال سے کہ شاید چند دن مس ٹریلانی کے والد کی نگرانی کیلیے وہیں رُکنا پڑے، مَیں نے چند جوڑے کپڑوں کے اور کچھ کتابیں ساتھ لے لیں، اس کے بعد اپنے مدد گاروں کو بعض مقدمات کے بارے میں ہدایات دیں اور اطمینان سے کینسنگٹن روڈ پر واپس آیا۔

سُورج تیزی سے مغرب کی طرف جُھک رہا تھا اور رات اپنی پوری حشر سامانیوں کے ساتھ گرد و پیش پر چھا رہی تھی۔ مَیں نے نرس کینیڈی، ڈاکٹر ونچسٹر اور مس ٹریلانی کو اُسی کمرے میں موجود پایا جس میں مسٹر ٹریلانی بے ہوش پڑے تھے۔ میرے پہنچتے ہی طے پایا کہ رات کو نگرانی کے لیے مختلف افراد کی ڈیوٹیاں مقرر کر دی جائیں۔ نرس کینیڈی چونکہ دن بھر اپنا فرض انجام دے چکی تھی، اس لیے اُسے ملحقہ

کمرے میں آرام کرنے بھیج دیا گیا اور اس کی ڈیوٹی رات بارہ بجے مقرر کی گئی۔ ڈاکٹر ونچسٹر کو بھی مس کینیڈی کا آدھی رات کے بعد نگرانی میں ساتھ دینا تھا۔

ڈِنر کے دوران میں سارجنٹ ڈاؤ اور مسز گرانٹ مسٹر ٹریلانی کے قریب بیٹھے رہے۔ اس کے بعد ہم نے انہیں کھانے کے لیے بھیج دیا۔ اب رات کے نو بج رہے تھے۔ تین گھنٹے کی پہلی ڈیوٹی میری اور مس ٹریلانی کی تھی۔ کمرے کی فضا میں موت کی سی خاموشی طاری تھی۔ مسٹر ٹریلانی کے جسم نے ایک لحظے کیلیے بھی جنبش نہ کی تھی اور مس ٹریلانی کی نگاہیں بدستور اپنے باپ کے چہرے پر جمی تھیں۔

مَیں نے اپنی کُرسی پر بیٹھ کر پائپ سلگایا، ایک دو کش لیے اور مس ٹریلانی کے معصُوم افسردہ چہرے کی طرف تکنے لگا۔ اس نے بھی نگاہ اُٹھائی، ایک غم انگیز مسکراہٹ اس کے لبوں پر نمودار ہوئی۔

"مسٹر ہالکم رز . . . یہ کیسا اتفاق ہے کہ قدرت نے ہمیں کس عجیب راستے سے ایک دوسرے سے وابستہ کر دیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ میرا رُواں رُواں آپ کی ان مہربانیوں کے لیے شکر گزار ہے۔"

"آپ بار بار یہ ذکر کر کے مجھے شرمندہ کر رہی ہیں۔" مَیں نے کسی قدر تلخ لہجے میں کہا۔ "ایک دوست کی حیثیت سے میں نے اپنا فرض ادا کیا ہے۔ ایک لمحے کے لیے فرض کر لیجیے کہ اگر مَیں اس طرح کی مصیبت میں پھنس جاتا اور مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہوتی تو کیا آپ انکار کر دیتیں؟"

مس ٹریلانی نے گردن جھکا لی، پھر چند لمحے بعد نظر بھر کر میری طرف دیکھا۔ اُف! وہ نظریں ــــ ان میں محبّت کا ایک عظیم قلزم موجیں مار رہا تھا۔ مَیں نے اپنے آپ کو اس سمندر میں ڈوبتے پایا۔

وقت چیونٹی کی رفتار سے بیت رہا تھا۔ کمرے کے مغربی گوشے کی دیوار پر لٹکے ہوئے سنہری کلاک کی ٹِک ٹِک ہر لمحے انتہائی پُراسرار ہوتی جا رہی تھی۔ ہمارے پاس گفتگو کا کوئی موضوع نہ تھا اور نہ یہ وقت کسی قسم کی علمی، سیاسی یا

رومانی گفتگو کا تھا۔ ویسے بھی خاموشی میں ایک عجیب طرح کا لُطف آرہا تھا۔ نہ جانے ہم دونوں کتنی دیر اسی طرح بیٹھے رہے۔ یکایک دروازہ آواز پیدا کیے بغیر کُھل گیا اور ڈاکٹر ونچسٹر کا سُتا ہُوا چہرہ نظر آیا۔ اُس کی آنکھیں یوں سُرخ ہو رہی تھیں جیسے بہت دیر تک آنسو بہا چکا ہو۔ مَیں نے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ میرا خیال تھا شاید وہ ڈیوٹی پر آیا ہے اور اُسے نگرانی کا صحیح پروگرام یاد نہیں رہا۔ تب اس نے مدّھم آواز میں کہا :

"معاف کیجیے، ابھی میری ڈیوٹی شروع نہیں ہوئی۔ اِس وقت مجھے آرام کرنے کے لیے اپنے بستر میں ہونا چاہیئے اور حقیقت یہ ہے کہ مَیں بستر پر لیٹ بھی چکا تھا، مگر آپ جانتے ہیں، مسٹر مالکم رڈز. . . . " ڈاکٹر نے جُملہ ناتمام چھوڑ کر گہری آہ بھری اور سلسلۂ کلام دوبارہ شروع کیا :

" آپ جانتے ہیں کہ مَیں ایک معالج ہی نہیں، مسٹر ٹریلانی کے احباب میں سے بھی ہوں۔ وہ مجھے بھائی کہتے اور سمجھتے تھے، اِس رشتے سے ان کی بیٹی میری بیٹی ہے اور مَیں اس کی پریشانی کسی طرح نہیں دیکھ سکتا۔ بس اسی خیال سے مجھے نیند نہیں آئی۔ پہلو پہ پہلو بدل کر جب تھک گیا تو یہاں چلا آیا۔ اَب میں چاہتا ہوں کہ ایک بار پھر اپنے مریض کا معائنہ کروں اور دیکھوں کہ اب اس کا جسمانی نظام کیسا ہے۔"

اُس نے مسٹر ٹریلانی کے سرہانے رکھا ہُوا برقی لیمپ روشن کیا۔ کمرے میں تیز روشنی پھیل گئی۔ میں نے دیکھا کہ مسٹر ٹریلانی اُسی طرح بے ہوش پڑے ہیں۔ ڈاکٹر ونچسٹر ان پر جُھک گیا اور پھر اُس کی لمبی پتلی اُنگلیاں مریض کے جسم کے مختلف حصّوں کو ٹٹولنے لگیں۔ کئی بار اس نے نبض کا جائزہ بھی لیا اور اپنی گھڑی سے اس کی رفتار کا مقابلہ کیا۔ یہ معائنہ تقریباً نصف گھنٹے جاری رہا۔ پھر ڈاکٹر نے گویا مطمئن ہو کر لیمپ بُجھا دیا اور ہمارے قریب آن بیٹھا۔

"میرے دِل میں دیر سے یہ خدشہ تھا کہ اس حادثے میں کہیں مسٹر ٹریلانی

کے کاسۂ سر کو کوئی صدمہ نہ پہنچا ہو۔ خدُا کا شکر ہے ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ میں نے پوری طرح اطمینان کر لیا ہے۔ سر پر کسی قسم کے زخم یا ضرب کی علامت نظر نہیں آئی۔ اگرچہ نبض کی رفتار کسی قدر سُست ہے، لیکن خطرے کی کوئی بات نہیں —— مجھے حیرت اِس امر پر ہے کہ خُون کی اِتنی بڑی مقدار بہ جانے کے باوجود مسٹر ٹریلانی کا چہرہ معمول کے مطابق تر و تازہ ہے۔ ان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اس کا چہرہ اب تک ہلدی کی مانند زرد پڑ چکا ہوتا۔ بہر حال تھوڑی دیر بعد مَیں اِنہیں طاقت کا ایک انجکشن لگاؤں گا۔ اِس موقع پر ہر طرح کی احتیاط لازمی ہے۔"

ڈاکٹر ونچسٹر ایک لمحے کے لیے سانس لینے کو رُکا اور پھر گویا ہوا :

" مریض کی یوں مستقل اور پُراسرار بے ہوشی کی وجہ بھی میری سمجھ میں نہیں آئی۔ میری دانست میں یہ ایک ریکارڈ ہے —— میرا خیال تھا شاید یہ بے ہوشی کسی نشہ آور دوا کے باعث ہے، مگر بغور معائنے کے بعد معلوم ہوا کہ میرا یہ شبہ صحیح نہ تھا۔ بہر حال یہ راز بھی جلد یا بدیر کھل جائے گا۔ ایک اور بات مجھے حیران پریشان کیے ہوئے ہے اور وہ یہ کہ مسٹر ٹریلانی کی کُہنی پر زخم کا جو گہرا نشان ہے، وہ آخر کس چیز کا ہے۔ مَیں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ زخم کسی چاقو یا خنجر سے ہرگز نہیں لگایا جا سکتا۔ میرے ذہن میں بار بار یہی خیال آتا ہے کہ کسی درندے نے اپنے نوکیلے پنجوں سے مسٹر ٹریلانی کی کلائی اُدھیڑ ڈالی ہے، مگر سوال یہ ہے کہ درندہ اِس مکان میں آ کیسے سکتا ہے۔"

چند لمحے تک وہ اپنے گنجے سر پہ ہاتھ پھیر کر گہری سوچ بچار میں گم رہا۔ پھر مس ٹریلانی کی طرف رُخ کر کے بولا :

"کیوں بیٹی، اِس مکان میں کوئی ایسا پالتُو جانور تو موجود نہیں جس کے پنجوں سے تمہارے باپ کو نقصان پہنچ سکتا ہو!"

اِس سوال پر مس ٹریلانی کے لبوں پر غم انگیز تبسّم نمودار ہُوا، میرے دل کی دھڑکن تیز ہوئی۔ مَیں نے اس کی مترنّم آواز سُنی، وہ کہہ رہی تھی :

"والد کو پالتو جانوروں سے کچھ زیادہ دلچسپی نہیں رہی۔ وہ کسی جانور کا گھر میں آنا یا رہنا گوارا نہ کرتے تھے البتہ انہیں جانوروں کی حنوط شدہ لاشیں پسند تھیں اور وہ آپ دیکھ سکتے ہیں کہ اس مکان میں کثرت سے ہیں۔ ان میں خونخوار کتے بھی ہیں اور جنگلی بلیاں بھی — بھیڑیے بھی ہیں اور چیتے بھی — جب میں اس مکان میں آئی تو ابتدا میں بڑی دہشت ہوئی۔ چنانچہ میں نے ایک خوب صورت چھوٹی سی ایرانی بلی خریدی۔ والد نے اس بلی کی موجودگی پر اعتراض کیا، مگر میں نے ضد کی کہ یہ بلی میں ضرور پالوں گی۔ اس پر وہ خاموش ہو گئے۔ صرف اتنی ہدایت کی کہ یہ بلی اُن کے کمرۂ خاص میں نہ گھسنے پائے۔ اگر اس بلی نے ایک مرتبہ بھی ایسی حرکت کی تو وہ اسے فوراً مکان سے باہر نکال دیں گے۔ میں نے والد کی یہ شرط مان لی اور اپنی بلی کی تربیت اس طرح کی کہ وہ والد کے کمرے کا رُخ ہی نہ کرتی تھی.... ویسے بھی وہ بڑی معصوم اور بھولی بھالی بلی ہے... میں ایک لمحے کے لیے بھی اُس کے بارے میں تصوّر نہیں کر سکتی کہ...."

دروازہ آہستہ سے ہلا، مس ٹریلانی بولتے بولتے چُپ ہو گئی اور ہم تینوں نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔ باہر سے ایسی آواز آ رہی تھی جیسے کوئی ہینڈل کو گھمانے کی کوشش کر رہا ہو۔ پھر کسی بلی کے ہلکی آواز میں میاؤں میاؤں کرنے کی آواز آئی۔ مس ٹریلانی کا چہرہ ایک دم روشن ہو گیا۔ وہ فوراً دروازے پر گئی اور دوسرے ہی لمحے ایک بھوری ایرانی بلی کو گود میں اُٹھائے کمرے میں واپس آئی۔

"اس کا نام سلویا ہے۔ اسے مجھ سے بڑی محبت ہے۔" مس ٹریلانی نے بلی کا ہم سے تعارف کراتے ہوئے کہا۔ "آپ دیکھتے ہیں کہ یہ ہزاروں لاکھوں بلیوں میں سے ایک ہے۔ اس کا حُسن بے مثال ہے۔ اس کے بال کس قدر گھنے اور لمبے ہیں ایک بالکل معصوم.... بے ضرر قسم کی نسل ہے — اس کی ایک خوبی یہ ہے کہ کسی بھی کمرے میں بغیر اجازت داخل نہیں ہوتی۔ پہلے دروازے پر دستک دے گی

جیسا کہ ابھی آپ لوگوں نے سُنا۔"

وہ پیار سے اپنی پالتو بلی کے بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ اب میں نے غور سے اس جانور کو دیکھا۔ بلاشبہ نہایت حسین اور نادر نسل کی بلی تھی۔ اُس کے جسم پر ریشم کی طرح سنہری اور گھنے بال تھے۔ دُم خاص طور پر لمبی اور گچھے دار۔ اس کے پنجے بھی غیر معمولی طور پر بڑے بڑے تھے۔ اس نے اپنی چمک دار نیلی آنکھیں گھما کر مجھے اور ڈاکٹر ونچسٹر کو گھورا، پھر اپنی مالکہ کے ہاتھوں سے پھسل کر نیچے بچھے ہوئے قالین پر آ گئی۔ ایک دو بار اُس نے کمرے کا جائزہ لیا اور پھر ہم نے حیرت اور خوف کی ملی جلی نظروں سے دیکھا کہ آنِ واحد میں بلی کی حالت میں ایک عظیم تغیّر رُونما ہوا۔ اس کے جسم کا ایک ایک رواں خوفناک انداز میں کھڑا ہو گیا۔ وہ پھول کر اپنے قد و قامت سے دُگنی دکھائی دینے لگی۔ بالکل ایک وحشی درندے کی طرح اس نے اپنے اگلے دونوں پنجے آگے بڑھائے۔ اب اس کے ناخن پوری طرح باہر نکلے ہوئے تھے اور وہ بُری طرح غراتے ہوئے کسی نادیدہ شے پر جھپٹنے کے لیے پوری طرح تیار تھی۔ اُس ایک یادگار اور بھیانک ثانیے میں میں نے بلی کی خونیں نظروں کا تعاقب کیا۔ کمرے کے شمالی گوشے میں آبنوس کی ایک قیمتی میز پر ایک بہت بڑی مصری بلی کی ممی رکھی تھی۔ سلویا نے اس پر چھلانگ لگائی اور اپنے پنجوں سے اسے بُری طرح اُدھیڑنے لگی —— مس ٹریلانی کے مُنہ سے ہلکی سی چیخ نکلی اور اس نے لپک کر سلویا کو پکڑ لیا اور گود میں چھپا کر واپس اپنی نشست پر آ گئی۔ اس مختصر سے وقفے میں سلویا پُرسکون ہو چکی تھی۔

"یہ تم نے کیا بدتمیزی کی سلویا ——" مس ٹریلانی نے ہلکا سا تھپڑ بلی کی گردن پر مار کر کہا۔ "تم نے ان معزز مہمانوں کا بھی کچھ خیال نہ کیا۔ اسی لیے ابا جان تمہیں اپنے کمرے میں گھسنے کی اجازت نہ دیتے تھے۔"

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سلویا پر اپنی مالکہ کے اس تھپڑ اور الفاظ کا گہرا اثر ہوا۔ اس نے بالکل مسکین بن کر اس کی گود میں مُنہ چھپا لیا۔

"اچھا، اب یہاں سے جاؤ اور اپنے بستر پر آرام کرو۔" مس ٹریلانی نے بلّی سے کہا اور اُس نے ہلکی سی میاؤں میں گویا جواب دیا کہ حکم کی تعمیل ہو گی۔

"جانے سے پہلے ان مہمانوں سے مصافحہ تو کرلو سلویا۔" مس ٹریلانی نے کہا اور بلّی کا دایاں پنجہ میری طرف بڑھایا۔ بلّی نے مصافحہ کرنے کے لیے اپنے پورے ناخن پنجے سے باہر نکال لیے اور یہ دیکھ کر دہشت سے میرا کلیجہ بیٹھ گیا کہ اُس حسین اور بے ضرر بلّی کے پنجے میں ناخنوں کی تعداد پانچ کے بجائے سات ہے۔ ڈاکٹر ونچسٹر نے بھی یہ غیر معمولی بات نوٹ کی اور اُس نے بدحواس ہو کر کہا:

"خدا رحم کرے — اِس بلّی کے ناخنوں کی تعداد سات ہے... میں نے اپنی زندگی میں ایسا کوئی حیوان نہیں دیکھا۔"

ایک حملہ اور

وہ رات، رات نہیں ایک قیامت تھی۔ ایک بھیانک اور لرزہ خیز خواب تھا جو میں نے دیکھا۔ لیٹنے کو بستر پر لیٹ تو گیا، لیکن نیند غائب تھی۔ میں نے ان تمام واقعات اور حالات پر غور کرنے کی کوشش کی، مگر ذہن اس قدر ماؤف اور پراگندہ تھا کہ کوئی معقول توجیہہ سمجھ میں نہ آئی۔ آہستہ آہستہ مجھ پر غنودگی سی طاری ہونے لگی اور پھر یوں محسوس ہوا جیسے میں ایک عجیب خواب دیکھ رہا ہوں۔ میرے کانوں میں کسی عورت کے چیخنے کی آوازیں مسلسل آ رہی تھیں۔ ایک جھٹکے سے آنکھ کھلی۔ میرا کمرہ گہری تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ نہ جانے سرہانے جلتا ہوا برقی لیمپ کس وقت بجھا۔ میں نے شدید سردی کے باوجود اپنے آپ کو پسینے میں ڈوبے ہوئے پایا۔ دِل اس بُری طرح دھڑک رہا تھا جیسے ابھی اچھل کر حلق سے باہر آ جائیگا۔ لرزہ خیز چیخوں کی آوازیں مسٹر ٹریلانی کی خواب گاہ سے آ رہی تھیں پھر میں نے سارجنٹ ڈاؤ اور مسز گرانٹ کی ملی جلی آوازیں سُنیں۔ چند لمحوں کے لیے میرا بدن جیسے پتھر کا ہو گیا۔ پھر میں یک لخت تڑپ کر اُٹھا اور مسٹر ٹریلانی کے کمرے کی طرف ننگے پاؤں دوڑا۔ اُن کا کمرہ برقی روشنی کے بجائے جھلملاتی موم بتیوں اور دھڑ دھڑ جلتے تیل کے لیمپوں سے روشن تھا اور ہر طرف ایک عجیب سی بدبُو پھیلی ہوئی تھی۔ سب سے پہلے میں نے جس شخص کو دیکھا، وہ سارجنٹ ڈاؤ تھا جس کے ہاتھ میں

ریوالور تھا اور وہ اپنی بڑی بڑی سرخ آنکھوں سے چھت کو گھور رہا تھا۔ میری آہٹ پاکر وہ یک لخت مڑا اور عالمِ بدحواسی میں مجھ پر فائر کرنے ہی والا تھا کہ میں نے چلّا کر کہا:

"سارجنٹ، ہوش میں آؤ —— یہ میں ہوں۔"

پھر میری نظر مس ٹریلانی پر گئی اور فرطِ دہشت سے میری چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی بدنصیب لڑکی کا لباس خون میں لت پت تھا اور چہرہ دُھلے ہوئے کپڑے کی مانند سپید۔ جیسے کسی نے جسم کا تمام خون نچوڑ لیا ہو۔ مسز گرانٹ ایک طرف کھڑی تھر تھر کانپ رہی تھیں اور ڈاکٹر ونچسٹر مُنہ کے بَل فرش پر بیہوش پڑا تھا۔ مسٹر ٹریلانی کے آہنی پلنگ کے قریب ہی ایک کُرسی پر نرس کینیڈی پتھر کا بُت بنی بے حس و حرکت بیٹھی تھی۔ اُس کی آنکھیں حلقوں سے باہر اور مُنہ اس طرح کھُلا تھا جیسے چیخنا چاہتی ہو، لیکن چیخ نہ نکل سکی اور منہ کھُلے کا کھُلا رہ گیا۔

سب سے حیرت انگیز بات یہ تھی کہ مسٹر ٹریلانی اپنے بستر پر نہ تھے، بلکہ عین اُسی جگہ یعنی آہنی سیف کے پاس پڑے تھے جہاں سے گذشتہ رات انہیں اُٹھایا گیا تھا اور اس مرتبہ اُن کی وہی زخمی کلائی اس بُری طرح اُدھڑی ہوئی تھی کہ اندر سے سفید سفید ہڈی جھانک رہی تھی۔ مسٹر ٹریلانی یہ ہاتھ سیف کی طرف اسی انداز میں بڑھائے ہوئے تھے جس کی رُوداد ایک روز قبل مجھے مس ٹریلانی سُنا چکی تھیں، لیکن اس مرتبہ نئی بات یہ تھی کہ آٹھ نو اِنچ لمبے پھَل کا نہایت تیز دھار خنجر مسٹر ٹریلانی کے پاس پڑا دِکھائی دیا جس پر آہستہ آہستہ خوُن جم رہا تھا۔ یہ خنجر پہلے اس کمرے ایک دِیوار پر سجا ہوا میں نے دیکھا تھا۔

مجھے دیکھ کر مس ٹریلانی کے حلق سے چیخ نکل ہی گئی اور پھر وہ مجھ سے لپٹ کر بچّوں کی طرح رونے لگی۔ سارجنٹ ڈاؤ نے مسز گرانٹ کو اشارہ کیا کہ نرس کینیڈی کو سنبھالیں اور خود ڈاکٹر ونچسٹر کو ہوش میں لانے کی تدبیر کرنے لگا۔ چند لمحے بعد ڈاکٹر نے آنکھیں کھولیں اور اُٹھ کر بیٹھ گیا اور ابھی وہ حیرت سے کچھ پوچھنے ہی والا

تھا کہ معاً اُس کی نظر مس ٹریلانی کے خون آلود لباس اور پھر سیف کے پاس پڑے ہوئے مسٹر ٹریلانی پر پڑی۔

"خدا کی پناہ . . ." وہ چلّایا: "پھر وہی قضیہ . . . مگر یہ ہُوا کیسے؟"

"یہی بات تو میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں ڈاکٹر" سارجنٹ ڈاؤ نے بھاری لہجے میں اس طرح کہا جیسے وہ ڈاکٹر ہی کو اس حادثے کا ذمہ دار سمجھتا ہو، لیکن اس سے پہلے کہ ڈاکٹر کچھ کہے، مسز گرانٹ کی آواز گونجی:

"ذرا نرس کو تو دیکھو . . . یہ غالباً مر چکی ہے۔"

اِن الفاظ نے دہشت کی ایک نئی لہر سب لوگوں کے بدن میں دوڑا دی۔ ڈاکٹر ونچسٹر نے جلدی سے نرس کینیڈی کا معائنہ کیا اور بولا:

"ابھی مری نہیں، زندہ ہے . . . . ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دہشت کے باعث اس کا یہ حشر ہوا ہے۔ ازراہِ کرم اسے دوسرے کمرے میں لے جا کر بستر پر لِٹا دو۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ آخری بار میں نے نرس کینیڈی کو دیکھا، تو وہ مسٹر ٹریلانی کے بستر کے نزدیک آرام کُرسی پر بیٹھی تھی۔ اس نے اپنی کمر کے پیچھے ایک تکیہ بھی لگا لیا تھا تاکہ سیدھی طرح بیٹھ سکے اور گردن جُھک نہ جائے اور اب اِتنی دیر بعد بھی وہ اُسی حالت میں بیٹھی دکھائی دی۔ بالکل بے حس اور پتھر کے ایک بے جان مجسّمے کی مانند —— اس کا چہرہ ہر قسم کے تاثرات سے خالی تھا۔ خوف یا دہشت کی بظاہر کوئی علامت نظر نہ آتی تھی۔ اس کی آنکھیں کھُلی تھیں اور پلکیں قطعی ساکن —— دُور سے کوئی دیکھتا تو یہی سمجھتا کہ ایک بُت کرسی پر بٹھا دیا گیا ہے جس میں کسی بھی لمحے جان پڑ سکتی ہے۔

مسٹر ٹریلانی کے بستر کی چادریں اور تکیے اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے تھے۔ قریب ہی وہ خون آلود پٹّی بھی پڑی تھی جو ڈاکٹر ونچسٹر نے مسٹر ٹریلانی کی کلائی کے زخم پر باندھی تھی۔ کچھ فاصلے پر اِس پٹّی کے چند اور ٹکڑے بھی پڑے دِکھائی دیئے۔ یہ بات عیاں تھی کہ کسی نے مسٹر ٹریلانی کے زخم سے ان پٹیوں کو نوچ

کر پھینک دیا ہے۔ مگر کس نے؟ اس سوال کا جواب پانا آسان نہ تھا۔

مسٹر ٹریلانی آہنی تجوری کے پاس اُسی انداز میں پڑے تھے جس انداز میں گذشتہ رات پائے گئے تھے اور اُن کا بایاں بازو پہلے کی طرح تجوری کی طرف بڑھا ہوا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خنجر کے ذریعے سونے کی وہ عجیب و غریب چوڑی بھی علیحدہ کرنے کی کوشش بھی کی گئی تھی جو مسٹر ٹریلانی کی بائیں کلائی میں پڑی ہوئی تھی اور اس کے اندر ایک ننھی منّی چابی پھنسی ہوئی تھی۔ زخمی کلائی سے اب بھی خون کے قطرے اُبل اُبل کر فرش پر گر رہے تھے۔

مَیں نے مارگریٹ کو دیکھا کہ وہ اپنے بے ہوش والد کے قریب کھڑی جُھک کر انہیں بغور دیکھ رہی ہے اور خود اس کے کپڑے بھی خون میں لت پت ہیں۔ یہ نہایت روح فرسا منظر تھا۔ میرے دل کی دھڑکن ہر لحظہ تیز ہوتی جا رہی تھی۔ سارجنٹ ڈاؤ اطمینان سے ایک گوشے میں کھڑا اپنے پستول میں کارتوس بھر رہا تھا۔ اس کے علاوہ کمرے میں گھر کے کئی نوکر بھی جمع تھے۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے اور وہ کون پُراسرار قوّت ہے جو اس گھر کا سکون درہم برہم کیے ہوئے ہے۔

دفعتہً میری موجودگی کا احساس کرتے ہی سارجنٹ نے پستول کو حرکت دی اور فائر کرنے ہی والا تھا کہ مَیں نے چیخ کر کہا:

"کچھ ہوش کرو سارجنٹ، کیا مجھ پر گولی چلا رہے ہو؟"

"معاف فرمائیے مسٹر رُوز، مَیں نے آپ کو اچھی طرح دیکھا نہ تھا۔ خدا نے آپ کو بچا لیا ورنہ مَیں لبلبی دبانے ہی والا تھا۔"

اِتنے میں مسز گرانٹ کا اُترا ہوا چہرہ نظر آیا۔ اس نے مارگریٹ کے کندھے پر محبت سے ہاتھ رکھا اور کہا:

"پیاری بیٹی، تمہارے سب کپڑے خون میں لت پت ہیں۔ آؤ لباس تو بدل لو۔"

چند لمحوں کے لیے مارگریٹ کمرے سے باہر چلی گئی اور لباس بدل کر واپس آئی۔ اس دوران میں ہم نے مسٹر ٹریلانی کو اُٹھایا اور پلنگ پر لٹا دیا۔ سارجنٹ نے زخم پر "پٹی" دوبارہ باندھنے کی کوشش کی، مگر ناکام رہا۔ خون کے قطرے اب بھی زخم سے برس رہے تھے۔ نرس کینیڈی اُسی طرح پتھر کا بُت بنی بیٹھی تھی۔ مارگریٹ نے حیرت انگیز سکون اور اطمینان سے کمرے میں موجود ہر فرد کے چہرے کا جائزہ لینا شروع کیا۔ پھر ہماری نظریں آپس میں ملیں اور مارگریٹ کے لبوں پر تبسم کی ایک عجیب لکیر نمودار ہوئی ——— مَیں نے ندامت سے گردن جھکا لی اور رُک رُک کر کہا:

"مجھے نہایت رنج ہے کہ مَیں اپنا فرض ادا کرنے سے غافل رہا ——— کوشش کے باوجود مسلسل جاگ نہ سکا اور میری آنکھ لگ گئی۔"

"آہ ..... مسٹر رُوز ..... کیسی عجیب بات ہے ..... آپ تو ہر طرح چاق چوبند تھے ....."

"مَیں خود حیران ہوں کہ مجھے کیا ہو گیا تھا۔ غالباً اس احساس نے مجھے پلک جھپکنے پر مجبور کر دیا ہو گا کہ نرس کینیڈی بھی تو آپ کے والد کی نگرانی کر رہی ہے۔"

مِس ٹریلانی نے میرے ان الفاظ پر ایک لحظہ غور کیا اور پھر مطمئن ہو کر نرس کینیڈی کی طرف قدم بڑھایا۔

"خدا کی پناہ ——— اِس بے چاری کو کیا ہُوا؟" اُس نے حیرت سے کہا۔ "ڈاکٹر ونچسٹر کو فوراً بلاؤ۔"

"ڈاکٹر صاحب ابھی آنے والے ہیں۔ ذرا اپنی حالت دُرست کر رہے ہیں۔" سارجنٹ نے کہا۔ "مگر ان کے آنے تک آپ براہِ کرم یہ بتائیں کہ کیا واقعہ پیش آیا۔ آپ نے کوئی خاص بات دیکھی؟"

مارگریٹ نے سارجنٹ کی طرف گہری نظروں سے دیکھا اور اپنی مترنم آواز

میں کہنے لگی:

"میں بیٹھے بیٹھے نہ جانے کس وقت نیند کی دنیا میں پہنچ گئی ... ایسی گہری نیند .... کہ بیان سے باہر ہے ..... دفعتہً یوں محسوس ہُوا کہ میرے قریب سے کوئی گزرا ہے ... یہ خواب کی حالت ہرگز نہ تھی ... میں اُسی وقت جاگ گئی تھی ... میرے اردگرد ایک عجیب نوعیت کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ کمرے میں روشنی بالکل نہ تھی، حالانکہ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اُس وقت برقی لیمپ بھی روشن تھا؛ تاہم کسی نے اُسے بجھا دیا تھا۔ قدموں کی وہ پُراسرار چاپ میں نے دوبارہ سُنی، جیسے کوئی دبے پاؤں اِدھر سے اُدھر گیا ہو۔ اب میرے جسم میں دہشت سے جھرجھری سی دوڑنے لگی ... مجھے یاد آیا کہ والد صاحب جب راتوں کو اُٹھ کر اپنے کمرے میں ٹہلا کرتے تھے تو اُن کے قدموں کی چاپ بالکل ایسی ہی ہوتی تھی۔ یہ یقیناً والد ہی ہیں جو کمرے میں چل پھر رہے ہیں — چنانچہ میں فوراً اُٹھ کھڑی ہوئی اور والد کے کمرے میں آئی۔ میں نے دیکھا کہ کھڑکیوں کے پردے ہٹے ہوئے ہیں اور پچھلے پہر کے چاند کی مدھم روشنی شیشوں سے چھن چھن کر کمرے میں آ رہی ہے اور پھر میں نے والد کو اس آہنی تجوری کے قریب اُسی حالت میں پڑے پایا جس حالت میں گزشتہ رات پایا تھا۔ میں ابھی انہیں دیکھ ہی رہی تھی کہ آپ یہاں آ گئے اور آپ نے برقی لیمپ روشن کیا۔ آپ نے خود دیکھا کہ والد کے زخم پر بندھی ہوئی پٹیاں کھل چکی تھیں، کلائی کے اوپر ایک نیا زخم نمودار ہو گیا تھا اور اس میں سے گرم گرم خون اُبل رہا تھا..."

سارجنٹ نے معنی خیز انداز میں کئی بار اپنی گردن کو جنبش دی جیسے سب کچھ سمجھ گیا ہو، پھر کہنے لگا:

"میری ناقص رائے یہ ہے کہ غیر متعلقہ افراد اس کمرے سے چلے جائیں۔ تاکہ ہم لوگ اطمینان سے اپنی باتیں کر سکیں۔"

مارگریٹ نے نوکروں کو وہاں سے چلے جانے کا اشارہ کیا اور سب نوکر

ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے۔ اب سارجنٹ نے ایک کرسی پر بیٹھ کر دو تین لمبے لمبے سانس کھینچے، اس کے بعد اپنا بیان یوں شروع کیا جیسے عدالت کے کٹہرے میں کھڑا ہو:

"پہلے تو میں نے زیادہ دیر تک جاگتے رہنے کی کوشش کی، مگر اس مقصد میں کامیاب نہ ہُوا۔ کچھ ایسا احساس ہے کہ میرے اردگرد نہایت مسحُور کن اور عجیب سی خوشبو پھیل رہی تھی جس نے مجھے آنکھیں بند کر کے سو جانے پر مجبور کر دیا۔ آپ دیکھتے ہیں کہ میں نے کپڑے بھی نہیں بدلے، وہی وردی اب تک پہنے ہوئے ہوں۔ کمرے کی بتی بھی نہیں بجھائی — نہ جانے کتنی دیر سویا ہوں گا کہ یکایک ایک ہولناک چیخ سے میری آنکھ کھُل گئی۔ یوں محسوس ہوا جیسے آواز بہت قریب سے آئی تھی۔ میں نے تکیے کے نیچے سے بھرا ہُوا پستول نکالا اور اندھا دھند مسٹر ٹریلانی کے کمرے کی طرف دوڑا۔ یہاں ہر طرف گھُپ اندھیرا تھا.... اور وہی پُراسرار خوشبو یہاں بھی پھیلی ہوئی تھی۔ بہرحال میں نے کمرے میں داخل ہو کر برقی لیمپ کا بٹن تلاش کر کے اسے دبایا اور جب روشنی ہوئی تو یہ لرزہ خیز منظر دکھائی دیا۔ آپ اپنے والد کے قریب کھڑی تھیں اور نرس کینیڈی اپنی نشست پر بیٹھی یوں اکڑ رہی تھی جیسے اس کے جسم میں برقی لہریں دوڑ رہی ہوں۔ میں ابھی تک سمجھ نہیں سکا کہ وہ چیخ کی آواز کس کی تھی۔ آپ کی یا نرس کینیڈی کی؟"

"غالباً میری ہی تھی —" مس ٹریلانی نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"بہرحال، اُسی لمحے میں نے دیکھا کہ اس کمرے کی شمالی کھڑکی کے نزدیک کوئی سفید سفید سایہ سا حرکت کر رہا ہے۔ میں نے اس پر فائر جھونک دیا۔ مگر کوئی اثر نہ ہُوا۔ سایہ بدستور حرکت کرتا رہا۔ میں نے دوسرا فائر کیا.... اب خیال آتا ہے کہ شاید یہ فریبِ نظر تھا۔ ورنہ کوئی ذی رُوح وہاں ہوتا تو دو گولیاں اُسے ختم کرنے کے لیے بہت تھیں — اس کے بعد مسٹر مالکم رُوز کمرے میں آ گئے

اور بخدا میں اُس وقت اپنے حواسوں میں نہ تھا۔ اگر یہ ایک لمحہ اور آواز نہ دیتے تو تیسری گولی میرے پستول سے نکل چکی تھی۔۔۔"

"مگر سارجنٹ، سوال تو یہ ہے کہ کیا واقعی تم نے کوئی سایہ دیکھا تھا؟" مَیں نے پوچھا۔

"خدا جانتا ہے مَیں نے اپنی آنکھوں سے وہ سایہ دیکھا۔ جیسے کفن میں لپٹا ہُوا کوئی مردہ ہو۔ لمبے قد کا ۔۔۔ اب اُس کا تصوّر کرتا ہوں تو بدن میں سوئیاں سی چبھنے لگتی ہیں۔"

"اچھا یہ تو بتاؤ کہ کیا واقعی تم نے دو فائر کیے تھے؟"

اِس سوال پر سارجنٹ نے گھُور کر میری جانب دیکھا اور طنزیہ لہجے میں کہنے لگا:

"معاف کیجیے بیرسٹر صاحب! یہ مذاق کا وقت بالکل نہیں ہے۔ یہاں سب کی جانوں پر بنی ہوئی ہے اور آپ کو تمسخر سُوجھ رہا ہے۔ فائروں کی آواز تو پورے لندن نے سُنی ہوگی۔ حیرت ہے آپ کیسے گھوڑے بیچ کر سو رہے تھے۔ آئیے، ان گولیوں کے نشانات تلاش کریں۔"

چنانچہ تھوڑی سی جستجو کے بعد سارجنٹ کے پستول سے نکلی ہوئی دونوں گولیوں کے نشان مل ہی گئے۔ پہلی گولی کھڑکی کا شیشہ چُور چُور کرتی ہوئی باہر نکل گئی تھی اور دوسری گولی لکڑی کی ایک الماری کی چوکھٹ میں پیوست ملی۔

"کہیے، اب تو آپ کو یقین آیا!" سارجنٹ نے کہا۔ اس کے بعد اس نے جھٹکے سے یہ الماری کھول ڈالی۔ اس میں مختلف خانے بنے ہوئے تھے اور ہر خانے میں مصر کے قدیم مقبروں سے لائی گئی بیش قیمت اشیاء رکھی تھیں۔ سب سے اوپر کے خانے میں چند چھوٹے چھوٹے جانوروں کی حنوط کی گئی ممیاں دھری تھیں۔ ان جانوروں میں ایک چھوٹا سا مگرمچھ بھی شامل تھا۔ بعد میں پتہ چلا کہ کسی زمانے میں مصر کے فرعونوں کا سرکاری نشان مگرمچھ ہُوا کرتا تھا۔

اتنے میں ڈاکٹر ونچسٹر حواس باختہ کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں

اپنا مخصوص سیاہ رنگ کا تھیلا تھا۔ کسی ملازم نے اُسے حادثے کے تمام پہلوؤں سے پہلے ہی آگاہ کر دیا تھا۔ اس نے آتے ہی کچھ پوچھے بغیر بیگ ایک طرف رکھا اور نرس کینیڈی کا معائنہ کرنے میں مصروف ہو گیا۔ چند لمحے تک اس کے جسم اور سَر کے مختلف حصوں کو دیکھنے بھالنے کے بعد اُس نے شاید دل ہی دل میں کوئی فیصلہ کیا، پھر نرس کو اسی حال میں چھوڑ کر مسٹر ٹریلانی کی طرف متوجہ ہوا۔ اُس نے حیرت انگیز پھرتی سے زخم صاف کیے، ان کو دھویا اور کوئی مرہم لگا کر دوبارہ پٹیاں باندھ دیں۔ مرہم کا فوری اثر یہ ہُوا کہ خون رِستا بند ہو گیا۔ اس کام سے فارغ ہو کر اس نے رومال سے اپنے ہاتھ صاف کیے، ایک کُرسی پر اپنے آپ کو گرایا اور ہانپتے ہوئے کہنے لگا:

"خدا ہم سب پر اپنا رحم کرے ۔۔۔ ایسی باتیں زندگی میں کبھی دیکھیں نہ سُنیں جو اس مکان میں پیش آ رہی ہیں۔ مسٹر ٹریلانی کی کیفیت تو وہی ہے جو گزشتہ رات تھی، مگر سوال یہ ہے کہ نرس کینیڈی کو کیا ہُوا؟"

"میرا خیال ہے دہشت سے اس کی یہ حالت ہو گئی ہے۔" سارجنٹ نے اپنے پائپ میں تمباکو بھرتے ہوئے کہا۔ "آخر بے چاری عورت ہے۔۔ صدمے سے ایسا ہونا ممکن ہے۔۔۔ جب ہم لوگ اس کمرے میں آئے تو یہ اسی حالت میں بیٹھی تھی۔ میرے دو فائروں کی آواز بھی اس کو ہوش میں نہیں لا سکی۔ تعجب ہے۔"

"فائروں کی آواز۔؟" ونچسٹر کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ "آخر فائر کرنے کی کیا ضرورت پیش آئی؟ کوئی نقب زن آن گھُسا تھا؟"

"جی ہاں، کچھ ایسا ہی سمجھ لیجیے۔" مَیں نے جواب دیا۔ "سارجنٹ ڈاؤ کا بیان ہے کہ انہوں نے اُس کھڑکی کے پاس کسی پُراسرار سایے کو حرکت کرتے دیکھا اور یکے بعد دیگرے دو گولیاں چلائیں۔ گولیوں کے نشان مل گئے ہیں، مگر اس سائے کا کوئی سراغ نہ مل سکا۔ سارجنٹ کو یقین ہے کہ وہ سایہ کسی لمبے قد کے مرد یا عورت کا تھا۔"

"خدا کی پناہ —" سارجنٹ چلّایا۔ "اب آپ نے اشارہ کیا تو یاد آیا۔ وہ سایہ مرد کا نہیں، واقعی عورت ہی کا تھا — مَیں اس کے لیے قسم کھا سکتا ہوں کہ وہ یقیناً 'عورت' کا سایہ تھا۔"

ہم سب، حیرت، اور خوف کی نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ ڈاکٹر ونچسٹر نے متفکرانہ انداز سے گردن ہلا کر کہا:

"یہ معاملہ روز بروز پیچیدہ ہوتا جا رہا ہے — نہ جانے اس کا سلسلہ کب تک جاری رہے گا اور کب ختم ہوگا۔"

اس کے بعد وہ مس ٹریلانی سے مخاطب ہُوا:

"مَیں نے نرس کا سرسری معائنہ کیا ہے۔ بلاشبہ دہشت سے اس پر سکتہ طاری ہو گیا ہے۔ تعجب ہے کہ اُس کے دل کی حرکت بند نہیں ہوئی، ورنہ خوف کی جس کیفیت سے وہ گزری ہے، اُس میں عام طور پر دل کی حرکت رُک جایا کرتی ہے۔ میرا خیال ہے نرس کو یہاں سے اُٹھا کر کسی اور کمرے میں منتقل کر دینا چاہیے —"

اُسی وقت، مسز گرانٹ کو طلب کیا گیا اور ڈاکٹر ونچسٹر نے اُنہیں چند ہدایات دیں۔ مسز گرانٹ صبر اور ضبط کے ساتھ تمام باتیں سُنتی رہی، پھر گردن ہلا کر رخصت ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ دو نوکروں کے ساتھ واپس آ گئی اور اُن سب نے مل جل کر نرس کینیڈی کو اُٹھایا اور دوسرے کمرے کی طرف لے گئے۔ ڈاکٹر ونچسٹر بھی اس ٹیم کے ساتھ گیا۔ سارجنٹ ڈاؤ کرسی پر بیٹھا مسلسل پائپ پی رہا تھا۔

پندرہ منٹ بعد ڈاکٹر ونچسٹر کمرے میں آیا اور کہنے لگا:

"نرس کی بے ہوشی یا سکتہ، جو کچھ، جو کچھ آپ کہیں، عجیب ہے — وہ بیک وقت ہوش میں ہے اور بے ہوش بھی — وہ سب کچھ سُنتی اور سمجھتی ہے، لیکن جواب نہیں دے سکتی۔ معلوم ہوتا ہے اس کے اعصاب سُن ہو کر رہ گئے ہیں۔ بہرحال میں نے اُسے ایک سریع الاثر انجکشن دیا ہے اور جب سوئی اس کی جلد میں

داخل ہوئی تو نرس کا بازو تھرتھرایا۔ اِس سے امید بندھتی ہے کہ وہ جلد ٹھیک ہو جائے گی۔"

"مگر ڈاکٹر صاحب، سوال تو یہ ہے کہ مسٹر ٹریلانی کب ہوش میں آئیں گے؟" میں نے پوچھا۔

"جنابِ والا، یہاں میرا سارا علم فیل ہو جاتا ہے۔ کچھ یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ مسٹر ٹریلانی کس عالم میں ہیں، اُن کے دل کا معائنہ کرتا ہوں تو وہ بالکل نارمل حالت میں ہے، دماغ کو دیکھتا ہوں تو قطعی ٹھیک کام کر رہا ہے۔ خون کی گردش جسم میں یقیناً درست ہے۔ اب اس سے زیادہ ایک شخص کی صحت کے لیے اور کیا ممکن ہے؟ مگر مسٹر ٹریلانی کا معاملہ ہی دنیا سے نرالا ہے —"

لندن کی زندگی آہستہ آہستہ بیدار ہو رہی تھی — دُور کہیں مُرغ مسلسل بانگیں دے رہے تھے اور دودھ تقسیم کرتے والوں کی بگھیاں سڑکوں پر دوڑنے لگیں تھیں۔ مسز گرانٹ کو بتایا گیا کہ وہ فی الحال دوسرے فرائض ترک کر دیں اور نرس کینیڈی کی دیکھ بھال کا ذمہ لے لیں۔ مسٹر ٹریلانی کی نگرانی کا فریضہ پہلے ہی میرے اور مارگریٹ کے پاس تھا۔ چند لمحے بعد جب مشرقی اُفق خاصا روشن ہو گیا اور بادِ نسیم کے جھونکے دم بدم تیز ہونے لگے تو مَیں نے منہ ہاتھ دھونے کی اجازت چاہی اور اپنی جگہ ڈاکٹر ونچسٹر کو مارگریٹ کے ساتھ چھوڑ گیا۔ سارجنٹ ڈاؤ نے کہا کہ وہ بھی کچھ دیر کے لیے رُخصت ہونا چاہتا ہے تاکہ رات کے واقعات کی رپورٹ ترتیب دے کر سکاٹ لینڈ یارڈ کے اعلیٰ افسروں کو پیش کر سکے۔

وہ سارا دن خوف، بے چینی، اضطراب اور کشمکش کے عالم میں گزرا۔ اس دوران میں مَیں نے کئی بار نرس کینیڈی کو جا کر دیکھا۔ اس کی حالت آہستہ آہستہ سُدھر رہی تھی اور آنکھوں کی پتلیاں رفتہ رفتہ حرکت کرنے لگی تھیں، تاہم اُسے اس حال میں دیکھ کر خوف سے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ڈاکٹر ونچسٹر چونکہ اپنی ذمہ داری پر اس نرس کو لایا تھا اور نرس کو تندرست حالت میں واپس لے جانا

اس کی ذمہ داری تھی، اس لیے وہ سخت پریشان تھا۔ سارا دن وہ نرس کی دیکھ بھال اور تیمارداری میں لگا رہا۔ کئی بار مختلف قسم کے انجکشن لگائے، دوائیں پلائیں اور ایک خاص تیل بھی مسز گرانٹ کو تیار کر کے دیا کہ نرس کے جسم پر ملا جائے۔ شام کو وہ تھوڑی دیر کے لیے باہر گیا اور جب واپس آیا تو دو اور نرسیں اُس کے ساتھ تھیں۔ ایک نرس کی ڈیوٹی کینیڈی پر لگائی گئی اور دوسری کو مسٹر ٹریلانی کے سرہانے نگرانی کے لیے مقرر کیا گیا۔ اس کے باوجود مس ٹریلانی مُصر تھیں کہ وہ رات بھر اپنے والد کے کمرے میں حاضر رہیں گی۔

اب ہم نے اپنے فرائض یوں تقسیم کیے کہ مسز گرانٹ اور ڈاکٹر ونچسٹر رات بارہ بجے تک مسٹر ٹریلانی کے پاس رہیں گے۔ اس کے بعد مس ٹریلانی مسز گرانٹ کی جگہ اور میں ڈاکٹر ونچسٹر کی جگہ ڈیوٹی سنبھالیں گے۔ سارجنٹ ڈاؤ تمام رات جاگے گا اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد نرس کینیڈی اور مسٹر ٹریلانی کے کمروں کی دیکھ بھال کرتا رہے گا۔ ڈاکٹر ونچسٹر کی ہدایت پر ہم سب کے لیے اُس پُراسرار خوشبو یا گیس سے محفوظ رہنے کا انتظام بھی کیا گیا اور اس مقصد کے لیے خاص قسم کے نقاب منگائے گئے جنھیں ضرورت کے وقت ناک اور منہ پر چڑھا لیا جاتا تھا۔

رات کا کھانا زہر مار کر کے ہم اپنی اپنی ڈیوٹیوں پر حاضر ہونے کے لیے تیار ہو گئے۔ اس روز موسم بھی ابتر تھا۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے، دن میں ہلکی ہلکی بوندا باندی بھی ہو چکی تھی۔ وقفے وقفے سے بجلی کوندتی تھی اور بادل گرجتے تھے۔ وقت آہستہ آہستہ سرکنے لگا اور رات کے تاریک سائے ہمارے گرد جمع ہونے لگے۔ مکان پر ایک بھیانک خاموشی مسلط تھی اور اس خاموشی میں ہم سب ایک دوسرے کے دلوں کے دھڑکنے کی آواز سُن سکتے تھے۔

رات بارہ بجنے سے چند منٹ پہلے جب میں اپنی ڈیوٹی پر مسٹر ٹریلانی کے کمرے میں داخل ہُوا تو صورتِ حال جوں کی توں تھی اور کوئی قابلِ ذکر واقعہ پیش نہ آیا تھا۔ آنے والی دو نرسوں میں سے ایک نرس مسٹر ٹریلانی کے سرہانے چاق چوبند بیٹھی تھی

ڈاکٹر ونچسٹر معمول کے مطابق اپنی کرسی دیوار کے ساتھ لگائے بیٹھا کسی گہری سوچ میں غرق تھا۔ اس کی آنکھوں پر گہرے سیاہ شیشوں کی عینک لگی تھی اور گیس کا نقاب اس نے ابھی سے اپنی ناک اور منہ پر چڑھا رکھا تھا۔ عام حالات میں اگر کوئی شخص ڈاکٹر ونچسٹر کو دیکھتا تو بے اختیار قہقہہ مار کر ہنس پڑتا، کیونکہ اس کی حالت ایسی ہی مضحکہ خیز تھی۔ میرے قدموں کی آہٹ پا کر ڈاکٹر نے گردن گھمائی اور اشارے سے چُپ رہنے کی ہدایت کی۔ میں کسی قدر حیران ہُوا، فوراً ہی میرے عقب میں کسی کے قدموں کی آہٹ بلند ہوئی۔ مُڑ کر دیکھا تو سارجنٹ ڈاؤ دبے پاؤں چلا آتا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں پستول تھا اور آنکھیں چمک رہی تھیں۔ ڈاکٹر ونچسٹر اپنی نشست سے اُٹھا اور میں اس کی کرسی پر جا بیٹھا۔ اس نے گیس نقاب اتارتے ہوئے سرگوشی کے لہجے میں مجھ سے کہا:

"میں اب تھوڑی دیر آرام کروں گا۔ خدا کرے یہ رات بخیر و عافیت کٹ جائے۔ اگر کوئی خاص بات ہو تو میں نیچے ہی ڈرائنگ روم میں موجود ہوں۔ فوراً جگا لیجیے گا۔ ویسے بھی سارجنٹ آپ کی مدد کے لیے یہاں موجود ہیں۔"

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور سارجنٹ کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرا کر بولا:

"آج میں ہر طرح مستعد اور ہوشیار ہوں۔ اگر حملہ آور کا تعلق اس دنیا سے ہے تو وہ آج مجھ سے بچ کر کہیں نہیں جا سکتا اور اگر وہ کسی اور دُنیا کی مخلوق ہے تب میرا اُس کے ہاتھوں بچنا دشوار ہے۔"

ابھی اس نے یہ جملہ ادا کیا ہی تھا کہ مس مارگریٹ ٹریلانی کمرے میں آئیں۔ انھوں نے گیس نقاب اوڑھ رکھا تھا۔ میرے قریب آ کر نقاب اتارا اور مسکراتے ہوئے کہا:

"امید ہے آپ ٹھیک ٹھاک ہوں گے ——— میں تو آج دن بھر خوب سوئی۔ کیا اس دوران میں کوئی خاص بات تو نہیں ہوئی۔"

"جی نہیں، ابھی تک ہر طرح امن ہے۔" میں نے مدھم لہجے میں جواب دیا۔

"اب رات کا تھوڑا حصّہ باقی رہ گیا ہے۔ خدا کرے یہ بھی بخیر و عافیت گزر جائے۔"

"نرس کینیڈی کا کیا حال ہے؟"

"میرا خیال ہے وہ بہت جلد ٹھیک ہو جائے گی۔ ڈاکٹر ونچسٹر اپنے علاج کے بارے میں خاصا مطمئن ہے۔ بہر حال آپ بھی نرس کو ایک نظر دیکھ آئیے۔"

"بہت اچھا۔ مَیں ابھی آئی۔"

چند لمحے بعد جب وہ واپس کمرے میں آئی تو اس کا چہرہ روشن تھا۔ کہنے لگی "خدا کا شکر ہے نرس کی حالت اب بہت بہتر ہے —— وہ اپنے بازو ہلا سکتی ہے، لیکن بول نہیں سکتی۔"

مارگریٹ نے گھڑی میں وقت دیکھا اور نقاب اپنے چہرے پر چڑھا لی اور یُوں ہماری ڈیوٹی شروع ہو گئی۔ کمرے میں اندھیرے اور روشنی کا امتزاج تھا، اگرچہ آہستہ آہستہ اندھیرا روشنی پر غالب آتا جا رہا تھا یا میرا احساس ہی کچھ اس قسم کا تھا۔ ہر آدھ گھنٹے بعد سارجنٹ چپکے سے دروازہ کھول کر اندر جھانکتا اور ہمارے اشاروں سے مطمئن ہو کر واپس چلا جاتا۔ مکان میں ایک اعصاب شکن سناٹا طاری تھا حتیٰ کہ بیرونی ٹریفک کی آواز بھی کانوں میں نہ آتی تھی۔ وقت چیونٹی کی رفتار سے گذر رہا تھا۔ گیس نقاب کے باعث ہم دونوں آپس میں بات چیت بھی نہ کر سکتے تھے اس طرح اکتاہٹ کا احساس اور بڑھتا جا رہا تھا۔

دفعتہً باہر غلام گردش میں لگے ہوئے قیمتی کلاک نے اپنی نقرئی آواز میں رات کے دو بجنے کا اعلان کیا۔ اس آواز نے عارضی طور پر کم از کم میرے اعصاب کو کسی قدر سکون بخش دیا۔ مارگریٹ کا کیا حال تھا۔ مَیں کہہ نہیں سکتا۔ تاہم اس نے اشارے سے ظاہر کیا کہ وہ بالکل ہوشیار اور خبردار ہے۔ چند لمحے پہلے سارجنٹ دروازہ کھول کر ہماری خیریت پوچھ گیا تھا۔ یکایک میرے دل کی دھڑکن خود بخود تیز ہو گئی اور یوں محسوس ہوا جیسے میرے بدن کے روئیں روئیں سے خون کے قطرے اُبل رہے ہیں۔ میرا جسم اُس وقت پتھر کا ہو گیا اور دہشت کی

ایک لہر ریڑھ کی ہڈّی سے ہوتی ہوئی گردن میں پہنچ گئی۔

یہ مختصر سے لمحے مجھ پر صدیوں کی مانند گزر گئے۔ اس کے بعد کچھ کچھ احساس ہونے لگا کہ مَیں پتھر کا نہیں، گوشت پوست کا بنا ہُوا انسان ہُوں۔ مَیں نے ایک جھرجھری سی لی اور اپنی نشست پر سیدھا بیٹھنے کی کوشش کی، مگر اُسی لمحے یوں احساس ہُوا جیسے کوئی نرم و نازک جاندار میری دائیں ٹانگ پر حرکت کر رہا ہے۔ اس کے بال ملائم تھے اور جب میری ٹانگ سے چھُوتے تو گدگدی سی ہوتی۔ دھڑکتے دِل سے مَیں نے نظریں جھکائیں اور یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ وہ تو مس ٹریلانی کی پالتو بِلّی سلیُو ہے۔ خدا جانے یہ منحوس جانور کیونکر کمرے میں داخل ہُوا جبکہ دروازہ ایک لمحے کے لیے بھی کھلا نہیں چھوڑا گیا تھا۔ مَیں نے اُسے لات مار کر پرے پھینکنا چاہا، لیکن وہ پھر میرے قریب آ جاتا۔ آخری مرتبہ مَیں نے اُسے پکڑنے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا ہی تھا کہ ایک خوفناک غراہٹ کے ساتھ اس خبیث بلّی نے میری کلائی میں اپنا سات ناخنوں والا پنجہ مارا۔ میرے حلق سے چیخ نکل گئی اور عین اُسی لمحے مَیں نے ایک سفید انسانی سائے کو کمرے میں حرکت کرتے دیکھا۔ مَیں اپنی تکلیف بھول گیا۔ یہ سایہ چند ثانیے بعد غائب ہو گیا اور مجھے مارگریٹ ٹریلانی کی صورت دکھائی دی۔ گیس نقاب اس نے اپنے مُنہ سے نوچ پھینکا تھا اور اب اپنی کرسی کے پاس کھڑی زور زور سے ہانپ رہی تھی جیسے سانس کھینچنے کی کوشش کر رہی ہو۔ اس کی آنکھیں باہر کو نکلی ہوئی تھیں۔ گلے کی رگیں پھُولی ہوئی اور چہرہ پسینے سے تر تھا۔

یکایک اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کو اس طرح حرکت دی جیسے کسی اَن دیکھے وجود کو پرے دھکیلنا چاہتی ہو۔ مَیں نے چھلانگ لگائی اور اُسے اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ مَیں نے محسوس کیا کہ دہشت سے مارگریٹ کا بدن بھی پتھر ہوتا جا رہا تھا اور اگر مَیں اسے سنبھال کر کمرے سے باہر لے جانے میں ذرا سی غفلت کرتا تو یقیناً اس کی حالت بھی ویسی ہی ہو جاتی جیسی حالت نرس کینیڈی کی ہو گئی تھی۔

راہداری میں آن کر مجھ سے ضبط نہ ہو سکا اور میں پھیپھڑوں کی پوری قوت سے چلّا اُٹھا:

"مدد .... مدد ...."

ابھی آواز کی گونج ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ سارجنٹ ڈاڈ راہداری کے پرلے سرے سے دوڑتا ہوا آیا، اس کے عقب میں مسز گرانٹ اور نئی نرسوں میں ایک نرس ڈورس بھی تھی۔ چند لمحے بعد مکان کے دوسرے حصّوں سے کئی اور ملازم بھی آن موجود ہوئے۔ سب کے چہروں پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں اور بعض افراد کے تو ہاتھ پیر بُری طرح کانپ رہے تھے۔

"ذرا انہیں سنبھالیے۔" میں نے مس ٹریلانی کو مسز گرانٹ کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ سارجنٹ ڈاڈ نے اس اثنا میں کمرے کی بتیاں جلادی تھیں۔ جب ہم سب افراد کمرے میں داخل ہوئے تو ایک ایسا لرزہ خیز منظر دکھائی دیا جس نے کم از کم میرے تو اوسان خطا کر دیے۔ نئی نرس کے منہ سے ہلکی سی چیخ بھی نکل گئی۔ مسٹر ٹریلانی اُسی آہنی تجوری کے قریب پڑے ہوئے تھے اور اُن کا دایاں ہاتھ تجوری کی جانب بڑھا ہوا تھا۔ زخم کی تمام پٹّیاں بُری طرح نوچ ڈالی گئی تھیں اور خُون ——— تازہ اور گرم خُون ——— یُوں اُبل رہا تھا جیسے پتھروں میں سے چشمہ پھُوٹتا ہے۔

"خدا کی پناہ ——— یہ کیا ہو رہا ہے۔" سارجنٹ نے کہا اور دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔ نرس ڈورس نے اپنے فرائض کا فوراً احساس کیا۔ نوکروں کی مدد سے مسٹر ٹریلانی کو اُٹھوا کر دوبارہ پلنگ پر اٹھایا اور جلد جلد اُن کے زخموں کو صاف کر کے نئی پٹیاں دوبارہ باندھنے لگی۔ چند لمحوں بعد خُون آپ ہی آپ رُک گیا۔ سارجنٹ ڈاڈ کمرے میں گھوم پھر کر جائزہ لے رہا تھا کہ یہ حادثہ آخر کیسے ہوا۔ ہر شے اپنی جگہ رکھی تھی اور وہاں کشمکش یا ہاتھا پائی کے کوئی نشانات نہ تھے۔

"حیرت .... سخت حیرت ... بخدا میں پاگل ہو جاؤں گا۔" سارجنٹ

بڑبڑایا۔ "یہ کسی انسان کی حرکت نہیں .... اس کا تعلق کسی اور دُنیا سے ہے۔"

سب لوگ خوف اور تعجب کی نظروں سے سارجنٹ کو تکنے لگے جو اِس وقت کسی اور عالم میں تھا ——— ابھی میں اُس کی بات کا جواب نہ دینے پایا تھا کہ مارگریٹ ٹریلانی دبے پاؤں کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کا چہرہ دُھلے ہوئے کپڑے کی مانند سفید تھا جیسے تمام شادابی اور رنگت نچوڑ لی گئی ہو۔ آنکھیں ویران اور دہشت زدہ، ہونٹ خشک اور تھرتھراتے ہوئے ——— وہ آتے ہی دھم سے ایک کرسی پر گر پڑی اور ہانپتے ہوئے کہنے لگی:

"خدا رحم کرے ... مجھے یُوں محسوس ہوا جیسے ناقابلِ برداشت بوجھ مجھ پر ڈالا جا رہا ہو۔ میری ہڈیاں اِس بوجھ تلے دب کر چٹخ رہی تھیں اور اگر مسٹر مالکم رُوز ایک لمحے کی بھی تاخیر کرتے اور مجھے کمرے سے باہر نہ لے جاتے تو میں زندہ نہ بچتی۔ مگر ... یہ آپ کی کلائی بھی تو زخمی ہے، اِس میں سے خون بہ رہا ہے۔ فوراً ڈاکٹر ونچسٹر کو بلاؤ۔"

اِس طویل وقفے میں میں اپنی کلائی کا زخم فراموش کر چکا تھا اور احساس ہی نہ تھا کہ اس میں سے ابھی تک خون کے قطرے رِس رہے ہیں۔ سارجنٹ ڈاڈ لپک کر میرے پاس آیا اور کلائی پکڑ کر غور سے زخم کا معائنہ کرنے لگا:

"یہ تو بالکل ویسا ہی زخم ہے جو مسٹر ٹریلانی کی کلائی پر دیکھا گیا ہے۔" اُس نے حیرت سے کہا۔

"شاید ...." میں نے جواب دیا۔ "مگر یہ سب مہربانی مس ٹریلانی کی پالتو بلّی کی ہے۔ اُسی نے تھوڑی دیر پہلے اپنا پنجہ میری کلائی میں گاڑ دیا تھا۔"

"مگر ... مگر، وہ تو میرے کمرے میں تھی۔ یہاں کیسے اور کب آئی؟" مارگریٹ نے کہا۔

مسز گرانٹ نے اِس موقع پر مداخلت کی اور کہا:

"نرس ڈورس کہتی ہے کہ تھوڑی دیر پہلے یہ بلّی نرس کینیڈی کے بستر پر پڑی

سو رہی تھی، یکایک اُٹھ کر اس کمرے میں آئی اور جب سارجنٹ نے احوال پوچھنے کے لیے باہر سے دروازہ کھولا تو یہ اندھیرے کا فائدہ اُٹھا کر کمرے میں گھس گئی۔ اُدھر نرس کینیڈی کی حالت پھر ابتر ہو گئی ہے۔ اس کا بدن ماش کے آٹے کی طرح اینٹھتا جا رہا ہے ـــ"

ڈاکٹر ونچسٹر اپنا بیگ لیے کمرے میں آیا۔ اس کی آنکھیں سُوجی ہوئی تھیں اور بال منتشر تھے۔ اُس نے گھومتی ہوئی نظر کمرے میں ڈالی، حالات کو فوراً بھانپ لیا، سب سے پہلے اس نے مسز ٹریلانی کے زخموں کا معائنہ کیا اور دوبارہ زخم دھو کر، دوا لگا کر، پھر اپنے ہاتھ سے پٹیاں باندھیں، اس کے بعد وہ میری طرف متوجہ ہُوا اور کچھ کہے بغیر میرا زخم بھی صاف کیا، مرہم لگایا اور پٹی باندھ دی۔ مَیں نے کچھ کہنے کے لیے زبان کھولنا چاہی۔ لیکن ڈاکٹر نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے روک دیا اور کہا:

"پہلے نرس کینیڈی کو دیکھ لُوں، اس کے بعد اطمینان سے بات ہوگی"

ڈاکٹر دوسرے کمرے میں گیا۔ مَیں اس کے ساتھ تھا۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ بے گناہ نوجوان نرس کس عذاب میں مبتلا کر دی گئی تھی۔ وہ برسوں کی بیمار نظر آتی تھی۔ آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی اور ان کی چمک دمک غائب، رخساروں کی ہڈیاں گال پچک جانے سے اور اُبھر آئی تھیں۔ ہونٹ سفید، گردن کی ایک ایک رگ اُبھری ہوئی ـــــ اُسے دیکھ کر کوئی نہ کہہ سکتا تھا کہ دو دن پیشتر یہی نرس حُسن اور صحّت کا ایک مثالی نمونہ تھی۔

ونچسٹر نے اس کی نبض دیکھی، دِل کے دھڑکنے کی رفتار کا اندازہ لگایا، پھر سرنج میں کوئی سریع الاثر ٹیکہ بھر کر نرس کے بازو میں لگا دیا۔ اس کے بعد نرس ڈورس کو ہدایت کرتے ہوئے کہا:

"مَیں نے اسے نشے کا ٹیکہ لگا دیا ہے۔ اس کے اعصاب منتشر ہو گئے ہیں اور کسی بھی وقت اس کی موت واقع ہو سکتی ہے، کیونکہ دماغ بھی اس صدمے سے متاثر ہو گیا ہے۔ بہر حال یہ تین چار گھنٹے تک اس ٹیکے کے زیرِ اثر رہے گی شاید

اِس طرح اس کے اعصاب کو کچھ سکون مل سکے۔ تم حتی الامکان یہیں ٹھہرو۔ اگر اس کے بدن میں کوئی خفیف سی حرکت بھی پیدا ہو تو فوراً مجھے آگاہ کر دینا۔"

"بہت بہتر ـــ مَیں آپ کی اِن ہدایات پر پُورا عمل کروں گی۔ شاید آپ کو علم نہیں کہ نرس کینیڈی میری خالہ زاد بہن بھی ہے اور ہم دونوں میں بڑی محبت ہے۔"

"اَب مجھے بھی اطمینان ہو گیا۔" ڈاکٹر نے گہرا سانس لے کر کہا۔ اس کے بعد وہ میری طرف مُڑا اور کہنے لگا:

"ہاں صاحب، اب مَیں فارغ ہوں۔ ذرا تفصیل سے بیان فرمائیے کہ کیا واقعہ پیش آیا؟"

مَیں نے ممکن حد تک تفصیلات بیان کیں۔ ڈاکٹر کان لگائے پُوری توجّہ سے سُنتا رہا۔ پھر بولا:

"معاملہ روز بروز پُراسرار بنتا جا رہا ہے ـــ بھلا سائنس کے اس عظیم دَور میں کوئی شخص اِن واقعات کی صحت پر یقین کرے گا؟ اچھّا خیر، آئیے منہ ہاتھ دھوئیے، پھر ناشتے کے بعد کچھ سوچتے ہیں کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔"

غم و اندوہ سے بھری ہوئی فضا میں ناشتہ کیا گیا۔ اِس دوران میں کسی شخص نے کوئی بات نہ کہی بلکہ سبھی اپنے اپنے خیالات میں گم رہے۔ اس کے بعد ڈاکٹر ونچسٹر مجھے اور مِس ٹریلانی کو ساتھ لے کر تمباکو نوشی کے کمرے میں گیا اور آرام دہ صوفوں پر بیٹھ کر اس نے لمبی تمہید باندھے بغیر براہِ راست معاملے پر گفتگو کا آغاز کر دیا:

"مِس ٹریلانی، آپ دیکھ رہی ہیں کہ صورتِ حال روز بروز سنگین اور خطرناک ہوتی جا رہی ہے۔ میری رائے یہ ہے کہ اِن حالات میں کسی ماہر سے مشورہ طلب کیا جانا چاہیئے۔"

"مجھے خوشی ہے ڈاکٹر کہ آپ نے آخر کار اِس کی ضرورت محسوس کر لی۔" مارگریٹ نے فوراً جواب دیا۔ "اب ماہر کو تلاش کرنا آپ کا کام ہے۔ بہر حال کوئی نام تو

آپ کے ذہن میں ہو گا؟"

"ہاں، میرے ذہن میں ایک شخص کا نام تو ہے، مگر پہلے مَیں تم سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا تمہارے ذہن میں بھی کسی کا نام آتا ہے؟ کوئی ایسا فرد جسے تمہارے والد بھی جانتے ہوں یا وہ تمہارے والد کو جانتا ہو؟ کیا کبھی تمہارے والد نے کسی شخص کو اِس مکان میں بُلایا اور اُس سے کسی بھی معاملے پر بات کی تھی؟"

"جی نہیں، ایسی کوئی بات کم از کم میرے سامنے نہیں ہوئی اور نہ کسی ماہر کا نام میرے ذہن میں ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ مَیں لندن میں تقریباً اجنبی ہُوں۔ گنتی کے چند افراد سے میرا ملنا جُلنا رہا ہے اور مسٹر مالکم رُوز بھی انہی افراد میں سے ایک ہیں۔ بہرحال آپ خود بتائیے کہ وہ شخص کون ہے جو ایسے نازک معاملات میں ہمارے لیے مفید ثابت ہو سکتا ہے؟"

ڈاکٹر وِنچسٹر نے سگریٹ کے دو تین کش لگائے، راکھ دان میں راکھ جھاڑی اور کہنے لگا:

"دُنیا میں ہر فن کے جاننے والے بہت سے افراد موجود ہیں۔ چین میں، جاپان میں، فرانس میں، ہندوستان میں، مصر میں — اور خود ہمارے مُلک انگلستان میں — مگر سوال یہ ہے کہ ہمیں کس قسم کا ماہر چاہیے؟ کوئی اعلیٰ درجے کا سرجن یا ماہرِ روحانیات یا کالے علم کا اُستاد؟ آپ کے والد کا کیس ایک عجُوبہ ہے — اُن کے روحانی اور جسمانی علاج کی ضرورت ہے۔ لندن میں سر جیمز ہی ایسے آدمی ہیں جو اِن دونوں علوم و فنون میں کامل سمجھے جاتے ہیں۔ اگر آپ کہیں تو میں اُن سے بات کروں؟"

"آپ کو اِس سلسلے میں مجھ سے کچھ پُوچھنے کی ضرورت نہیں ہے۔" مارگریٹ نے کہا۔ "آپ پر مجھے کامل اعتماد ہے۔ سر جیمز کو جتنی جلد ممکن ہو، بلا لیجیے۔"

"بہت بہتر — مَیں آج ہی اُن کے پاس جاتا ہوں۔" وِنچسٹر نے کہا۔ پھر مجھ سے مخاطب ہو کر کہا:

"آپ کے زخم بھی گہرے ہیں، لائیے دوبارہ اِنہیں دھو کر پٹّی باندھ دوں۔"

"ایسے گہرے بھی نہیں ہیں۔" مَیں نے ہنس کر کہا۔ "معمولی خراشیں ہیں۔"

"آپ اِنہیں خراشیں کہتے ہیں!" وِنچسٹر نے حیرت سے کہا۔ "کسی بھی جانور کے ناخن کی خراش اِنسانی جلد کے لیے خطرے کا باعث بن سکتی ہے۔ ان ناخنوں میں زہر ہوتا ہے جو آہستہ آہستہ پورے بدن میں سرایت کر جاتا ہے اور پھر یہی زخم ناسُور بن جاتے ہیں جن کا کوئی علاج ممکن نہیں۔ نتیجہ یہ کہ بعض حالتوں میں پورے کے پورے ہاتھ اور پَیر کاٹ ڈالے گئے ہیں —"

مَیں خوف سے لرز گیا اور مَیں نے اسی وقت دوبارہ ڈریسنگ پر آمادگی ظاہر کر دی۔

وِنچسٹر نے میری کلائی سے پٹّیاں کھولیں اور محدب شیشے کے ذریعے ان خراشوں کا معائنہ کرنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت اور خوف کے آثار تھے۔

"پناہ بخُدا، یہ بالکل ویسی ہی خراشیں ہیں جیسی مسٹر ٹریلانی کی کُہنی پر آئی ہیں — اِس کا مطلب یہ ہے کہ مارگریٹ کی پالتو بلّی ہی ان وحشیانہ سرگرمیوں میں ملوّث ہے۔ مس ٹریلانی، آپ کو اپنے اِس پالتو درندے کی کڑی نگرانی کرنی چاہیے۔ بہتر یہ ہے اسے چند روز کے لیے کہیں اور بھجوا دیں۔"

"مَیں آج ہی اُسے مکان سے نکلوائے دیتی ہوں۔" مس ٹریلانی نے کہا "اب تو مجھے بھی اس سے خوف آنے لگا ہے — سمجھ میں نہیں آتا اُسے کیا ہو گیا ہے۔"

"دراصل حیوانات میں عام طور پر ایسی عجیب صلاحیتیں پائی جاتی ہیں جو انسانوں میں نہیں ہوتیں۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "اور مَیں نے بلّیوں کے بارے میں تو سُنا ہے کہ اِن میں عجیب و غریب حسّیات ہوتی ہیں۔ بہرحال آپ اپنی بلّی سے خوف نہ کھائیں، فی الحال چند روز کے لیے اُسے اپنے سے الگ کر دیں۔"

دوپہر گیارہ بجے ڈاکٹر وِنچسٹر سر جیمز کے ساتھ واپس آیا۔ پہلی نظر ہی میں مجھے احساس ہو گیا کہ وہ غیر معمولی شخصیت کا حامل ہے۔ لمبا قد، بھاری جسم، بھرا بھرا

پرُرعب چہرہ، گھنی مونچھیں، فراخ پیشانی مضبوط اور چوڑی ٹھوڑی اور انتہائی چمک دار آنکھیں۔ ایسا خوبصورت اور وجیہہ آدمی بہت کم دیکھنے میں آتا ہے، اور مجھے یہ کہنے میں کوئی شرم محسوس نہیں ہوتی کہ مجھے اس کی شخصیت پر رشک آنے لگا۔

اُس نے آتے ہی گہری نگاہوں سے ہر شے کا جائزہ لیا اور تعارف کے فوراً بعد یوں گھُل مِل گیا جیسے برسوں کی شناسائی ہو اور یہ اس کی شخصیت کا گہرا اثر تھا کہ خوف و ہراس کی وہ اعصاب شکن فضا جس نے گزشتہ کئی راتوں سے ہمیں جکڑ رکھا تھا اب کافور ہو چکی تھی۔ ایک عجیب قسم کے اطمینان کا سا احساس مجھے ہو رہا تھا کہ سر جیمز کی آمد کے بعد گویا پریشانیاں ختم ہو گئی ہیں۔

وہ سب سے پہلے ڈاکٹر ونچسٹر کی معیت میں مسٹر ٹریلانی کے کمرے میں گیا اور دیر تک وہیں رہا ـــــ اس دوران میں اس نے کیا دیکھا اور کیا کچھ کیا، مَیں اس بارے میں یقین سے نہیں کہہ سکتا، کیونکہ ہم لوگوں کو کمرے میں آنے کی اجازت نہ تھی صرف ایک مرتبہ اس نے نئی نرس ڈورس کو کمرے میں طلب کیا، مگر چند لمحوں بعد ہی واپس بھیج دیا۔ اس کے بعد وہ دونوں یعنی سر جیمز اور ڈاکٹر ونچسٹر نرس کینیڈی کے کمرے میں گئے اور یہاں بھی جاتے ہی سر جیمز نے اس نرس کو باہر بھیج دیا جو مس کینیڈی کی دیکھ بھال پر مقرر کی گئی تھی ـــــ

مجھے بعد میں ڈاکٹر ونچسٹر نے بتایا کہ سر جیمز نے تو کمال ہی کر دیا۔ وہ غالباً ہپناٹزم کا ماہر بھی تھا۔ اس نے نرس کینیڈی کو اس حد تک ٹھیک کر دیا کہ وہ نہ صرف اپنے جسم کو آسانی سے حرکت دینے لگی، بلکہ اُس کی بند زبان بھی کھُل گئی اور اُس نے سر جیمز کے تمام سوالوں کا جواب ٹھیک ٹھیک دیا۔

نرس کینیڈی کے کمرے سے نکل کر وہ دونوں لائبریری میں گئے اور دیر تک آپس میں بحث مباحثہ کرتے رہے۔ اُن کی آوازیں اگرچہ باہر تک آ رہی تھیں، تاہم اُن کا مفہوم ہم میں سے کسی کے پلّے نہیں پڑ رہا تھا۔ مس ٹریلانی میرے

قریب ہی بیٹھی تھیں اور اُن کے چہرے پر ایک رنگ آتا اور ایک جاتا تھا۔ وہ بے چینی سے بار بار کرسی پر پہلو بدلتیں، مگر کیا مجال جو زبان سے ایک لفظ بھی نکلا ہو۔ دراصل وہ اپنے بے ہوش والد کے بارے میں جلد سے جلد یہ معلوم کرنے کی خواہش مند تھی کہ وہ کب تک ٹھیک ہو جائیں گے۔

آخر کار انتظار کی کٹھن گھڑیاں ختم ہوئیں اور وہ دونوں لائبریری سے باہر نکلے۔ سر جیمز کا چہرہ ہر قسم کے تاثرات سے یکسر خالی تھا؛ البتہ اُن کے ہونٹ سختی سے بھنچے ہوئے تھے۔ اس کے برعکس ڈاکٹر ونچسٹر کا چہرہ زرد تھا اور مجھے یہ احساس ہوا کہ چند لمحے پہلے یہ چہرہ ضرور سُرخ رہا ہوگا۔ سر جیمز نے مجھے اور مس ٹریلانی کو اشارے سے قریب بُلایا اور کہا:

"معاف فرمایئے، آپ کو خواہ مخواہ انتظار کی زحمت برداشت کرنا پڑی۔ دراصل معاملہ کچھ ایسا پیچیدہ اور اُلجھا ہُوا ہے کہ ہمارے لیے کسی قابلِ اعتماد نتیجے پر پہنچنا بہت دشوار ہو رہا ہے۔ میرے بعض نظریات سے ڈاکٹر ونچسٹر کو اختلاف ہے اور یہی کیفیت میری ہے۔ بہر حال آیئے، لائبریری ہی میں بیٹھتے ہیں، یہاں کی فضا مجھے پسند آئی ہے۔"

جب ہم اپنے اپنے صوفوں پر اطمینان سے بیٹھ چُکے، تب سر جیمز نے پائپ نئے سرے سے سُلگاتے ہوئے مجھ سے کہا:

"مَیں سمجھتا ہوں کہ آپ اور ڈاکٹر ونچسٹر، دونوں حضرات، مس ٹریلانی کے مخلص اور ہمدرد دوستوں میں سے ہیں اور ڈاکٹر کی طرح آپ بھی اِس کیس کی مبادیات کا اچھی طرح علم ہے۔ اس لیے میری ناقص رائے میں آپ کو بھی ہر مرحلے پر ہمارے ساتھ رہنا ہوگا۔ یہ ہمارے لیے مدد اور تعاون کی بہترین شکل ہوگی۔ آپ یقین فرمایئے کہ مَیں آپ کے نامِ نامی سے پہلے بھی آگاہ تھا۔ ایک قانون دان کی حیثیت سے آپ کی شہرت لندن کے علمی حلقوں میں پھیل رہی ہے اور یہ واقعہ ہے کہ مَیں آپ سے ملاقات کا خواہش مند تھا، لیکن کیا معلوم تھا کہ یہ ملاقات ایسے عجیب ماحول میں ہو گی۔ بہر حال مَیں اصل موضوع کی طرف آتا ہوں۔ ڈاکٹر

ونچسٹر نے جو حالات بیان کیے ہیں، اُن سے تو ہر شخص بھی اندازہ کرنے میں حق بجانب ہو گا کہ یہ نقب زنی یا چوری کی واردات ہے —— حملہ آور وہ جو کوئی بھی ہے۔ مرد یا عورت، باہر سے نہیں آتا۔ بلکہ اسی مکان میں کہیں موجود ہے —— اُنہی افراد میں سے ایک ہے جو گزشتہ تین دنوں اور تین راتوں سے یہاں مقیم ہیں —— میں نے مسٹر ٹریلانی کے زخموں کا بھی معائنہ کیا ہے۔ بلاشبہ وہ کسی بلّی کے خوفناک پنجوں ہی سے آ سکتے ہیں اور ڈاکٹر ونچسٹر کا بیان ہے کہ مس ٹریلانی کی پالتو بلّی دو مرتبہ مسٹر ٹریلانی کے کمرے میں پائی گئی ہے اور ایک بار اُس نے مسٹر مالکم رُوز کی کلائی پر بھی پنجہ مارا ہے۔ بلاٹنگ پیپر پر اِس بلّی کے پنجوں کے نشانات کی داب ڈاکٹر ونچسٹر کے پاس ہے۔ اس کے معائنے سے بھی پتہ چلتا ہے کہ یہ حرکتیں اُسی بلّی کی ہیں، مگر سوال یہ ہے کہ وہ ایسا کیوں کرتی ہے؟ میں نے مسٹر ٹریلانی کے کمرے میں دوسری ممیوں کے علاوہ ایک سیاہ بلّی کی ممّی بھی دیکھی ہے، اور مجھے بتایا گیا ہے کہ ابتدا میں آپ کی پالتو بلّی نے سیاہ بلّی کی اس ممّی پر بھی حملہ کیا تھا۔ بعض جانور ایک دوسرے کا وجود برداشت نہیں کرتے۔ ممکن ہے آپ کی پالتو بلّی کو اس دوسری سیاہ بلّی کا وجود پسند نہ ہو اور اس نے اسی سبب سے اس حملہ کیا ہو۔ ویسے بھی مسٹر ٹریلانی کے کمرے کی فضا بڑی بوجھل ہے۔ وہاں رات کے سناٹے میں اور گہری تاریکی میں، جانور تو جانور کسی بھی اچھے بھلے آدمی کا دماغ پھر سکتا ہے۔

اب رہا مسٹر ٹریلانی کی مسلسل بے ہوشی کا تعلق —— تو میری رائے یہ ہے کہ اُنہیں فوراً اُس کمرے سے ہٹا کر کسی ہوادار، روشن اور صاف ستھرے کمرے میں لے جایا جائے۔ ڈاکٹر ونچسٹر بھی میری اس رائے سے متفق ہیں کہ اُس کمرے کی فضا میں بہت سی زہریلی گیسیں اور خوشبوئیں شامل ہیں جو ان کے اعصاب اور خصوصاً دماغ کے اعصاب کو سُلا دینے کی کوشش کرتی ہیں، اور انہی کا یہ تاثر ہے کہ آپ لوگوں کو اندھیرے میں سفید سفید سائے سے حرکت

کرتے نظر آتے ہیں۔ مجھے علم ہے مس ٹریلانی کہ آپ اپنے والد کی ہدایات پر پُوری طرح عمل کر رہی ہیں۔ ان ہدایات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ مسٹر ٹریلانی کو ہرگز ہرگز کسی حال میں بھی، ان کے کمرے سے باہر نہ لے جایا جائے اور نہ اس کمرے کی کوئی چیز وہاں سے کہیں اور منتقل کی جائے۔ اگر ایسا کیا گیا تو خود مسٹر ٹریلانی کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ آخر ایسا کرنے میں کیا ہرج ہے۔ آپ مسٹر ٹریلانی کو میری ذمہ داری پر کسی اور کمرے میں منتقل کر دیں، پھر دیکھیے وہ کتنی جلد ہوش میں آتے ہیں۔ کیا آپ نے نرس کینیڈی کی حالت سے کوئی سبق نہیں لیا۔ اس کا یہ حال دہشت یا خوف کے باعث نہیں ہوا ہے، بلکہ خود اُس کا بیان یہ ہے کہ کمرے میں ایسی خوشبو لسی ہوئی ہے جو براہِ راست دماغ پر اثر انداز ہوتی ہے اور پھر جسم کے اعصاب کو بھی بے کار کر دیتی ہے ——"

وہ یک لخت اُٹھ کھڑا ہُوا اور چند لمحے خاموشی سے پائپ پینے کے بعد مس ٹریلانی سے کہنے لگا:

"میں اب اجازت چاہتا ہوں —— اگر آپ یہ کیس میرے سپُرد کرنا چاہتی ہیں تو آپ کو اپنے والد کی دی ہوئی ہدایات پر عمل کرنے کے بجائے میری ہدایات پر عمل کرنا پڑے گا، ورنہ میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ آپ اپنے دوستوں سے اِس سلسلے میں مزید مشورہ کر کے ڈاکٹر ونچسٹر کی معرفت آج ہی کسی وقت اپنے فیصلے سے آگاہ کیجیے —— اور اب چلتے وقت میں آپ سے پھر عرض کرتا ہوں کہ مسٹر ٹریلانی کو یہاں سے کسی اور جگہ منتقل کر دیجیے۔"

اس نے سب سے ہاتھ مِلایا اور چلا گیا۔

سر جیمز کے جانے کے بعد دیر تک کوئی نہ بولا۔ سب کے ہونٹوں پر جیسے مہرِ خموشی لگ گئی تھی۔ آخر میں نے اس مُہرِ سکوت کو توڑتے ہوئے کہا:

"کہیے اَب کیا ارادے ہیں؟"

ڈاکٹر ونچسٹر نے گردن کو جنبش دی:

"اس کا فیصلہ مس ٹریلانی کریں گی کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ سر جیمز کی رائے قبول کرنے یا اسے رَد کر دینے کا اختیار انہی کو ہے۔"

مس ٹریلانی نے سرد آہ بھری اور بھرّائی ہوئی آواز میں کہا :

"کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کیا جائے —— میرا خیال یہی ہے کہ سر جیمز کا مشورہ قبول کر لینا چاہیے۔ وہ تجربے کار اور عقل مند آدمی ہیں۔ یقیناً جب وہ پُوری ذمّہ داری لینے کو آمادہ ہیں تو ہمیں کیا تشویش ہو سکتی ہے۔"

ڈاکٹر ونچیسٹر کے مُرجھائے ہوئے چہرے پر روشنی سی پھیل گئی۔ اس نے خوش ہو کر کہا :

"میری خواہش بھی یہی تھی کہ سر جیمز کی بات مان لی جائے۔ خدا نے چاہا تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا —— تو بس، زیادہ تاخیر مناسب نہیں —— میں ابھی اُن کے پیچھے پیچھے جاتا ہُوں اور کہہ دیتا ہوں کہ سارا کیس آپ کے حوالے ہے، جو جی میں آئے کیجیے، ہم ہر طرح تعاون کے لیے تیار ہیں۔"

"مگر اس میں ایک قانونی پہلو آپ لوگ نظر انداز کر رہے ہیں۔" میں نے کہا۔

"وہ کیا؟ براہِ کرم جلد بیان فرمائیے۔" مس ٹریلانی نے حیرت سے پوچھا۔

"آپ کے والد کے مشیرِ قانونی مسٹر ماردِن شاید آپ کو ایسا کرنے کی اجازت نہ دیں۔ مسٹر ٹریلانی نے آپ کو جو ہدایات دی ہیں، اُن کی ایک نقل مسٹر ماردِن کے پاس بھی ہے۔ بہتر یہ ہے کہ آپ انہیں طلب فرمائیں اور بات کریں۔"

مس ٹریلانی نے اِس تجویز کو سراہا اور اُسی وقت ایک رقعہ مسٹر ماردِن کے نام لکھ کر ملازم کے ہاتھ روانہ کر دیا۔ ایک گھنٹے بعد مشیرِ قانونی تشریف لے آئے اور اُنھوں نے وقت ضائع کیے بغیر گفتگو شروع کر دی۔

"مَیں آپ کی پریشانی سے خوب واقف ہوں۔" انہوں نے مارگریٹ سے کہا۔ "اب بلا تکلّف فرمائیے کہ مَیں کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

"مسٹر ماردِن، براہ کرم مجھے میرے والد کے حالاتِ زندگی سے آگاہ فرمائیے۔

آخر یہ قِصّہ کیا ہے؟"

ماردِن کا مُنہ حیرت سے کھُل گیا۔ پھر اُس نے کنکھیوں سے میری جانب دیکھا اور کہنے لگا :

"کیا ہم علیحدگی میں بات نہ کریں؟"

"اوہ .... آپ اِس بارے میں مطلق فِکر نہ کریں مسٹر ماردِن۔" مارگریٹ نے کہا۔ "مسٹر مالکم رُوز میرے بہترین اور قابلِ اعتماد دوست ہیں۔ انہیں اب تک کے تمام حالات کا بخوبی علم ہے اور یہ قدم قدم پر میرا ساتھ دے رہے ہیں آپ کھُل کر بات کیجیے۔ یہ گفتگو ہمارے درمیان ہی رہے گی اور بات باہر نہ جائے گی۔"

"بہت بہتر —— اَب مجھے بھی اطمینان ہو گیا۔" خرّانٹ مسٹر ماردِن نے مجھے چُبھتی ہوئی نظروں سے دیکھا اور اپنا چمڑے کا بھاری تھیلا کھول کر چند کاغذ برآمد کیے —— ناک کی پھُننگی پر پُرانی عینک کو اچھی طرح جما کر اُس نے اِن کاغذوں میں سے ایک کاغذ الگ کیا۔ پہلے اسے کئی بار بغور پڑھا، پھر کہنے لگا:

"مس ٹریلانی، مجھے علم نہیں کہ آپ کیا کارروائی کرنا چاہتی ہیں، تاہم آپ کے والد کی ہدایات مَیں ایک بار پھر آپ کو پڑھ کر سنا دیتا ہُوں۔ ان کی تعمیل بہر حال آپ پر فرض ہے۔ خواہ حالات کیسا ہی رُخ اختیار کریں۔ پہلی شرط یہ ہے کہ جب تک مسٹر ٹریلانی کے جسم میں سانس کی آمد و رفت جاری ہے، اُنہیں اُن کے کمرے سے ہرگز ہرگز نہ ہٹایا جائے۔ دوسری شرط یہ ہے کہ اُس کمرے کی کسی شے کو بھی وہاں سے کسی دوسری جگہ نہ رکھا جائے نہ کہیں اور منتقل کیا جائے۔ خواہ وہ شے کتنی ہی حقیر معلوم ہوتی ہو —— میرے پاس ان عام اشیا کی فہرست موجود ہے جو مسٹر ٹریلانی کی خواب گاہ میں رکھی ہیں۔"

"مسٹر ماردِن، کیا آپ مجھے وہ فہرست دکھائیں گے؟" مارگریٹ نے پوچھا۔

"افسوس، صد افسوس۔ میں اِس حکم کی تعمیل سے معذور ہوں" —— ماردِن نے صاف انکار کرتے ہوئے کہا۔ "مسٹر ٹریلانی کی ہدایت کے مطابق جب تک

اُن کی موت واقع نہ ہو جائے، مَیں یہ فہرست کسی کو بھی دکھانے کا مجاز نہیں ہوں۔ البتّہ ....."

اُس نے جملہ نامکمّل چھوڑ دیا جس کا مفہوم مس ٹریلانی پر خوب واضح ہو چکا تھا۔ وہ چند لمحے خاموشی سے مارون کی طرف دیکھتی رہیں، پھر گردن جُھکا کر بولیں:

"بہت بہت شکریہ ..... مَیں اب تقدیر پر شاکر و راضی ہوں۔"

"اچھا تو مَیں اجازت چاہتا ہوں۔" مسٹر مارون نے اُٹھ کر ہاتھ ملایا اور چلا گیا۔

ڈاکٹر ونچسٹر کو فوراً ہی مس ٹریلانی نے سر جیمز کے پاس جانے سے روک دیا اور کہا کہ اَب جو خدا کو منظور ہے، وہ ہونے دیجئے۔ مَیں اپنے والد کی اتنی سخت ہدایات کی خلاف ورزی نہ کروں گی۔ انہوں نے آخر کچھ سوچ سمجھ کر ہی یہ ہدایات جاری کی ہوں گی۔ ڈاکٹر ونچسٹر خاموش رہا۔

اتنے میں مسز گرانٹ اپنا اُداس چہرہ لیے نازل ہو گئیں۔ مس ٹریلانی نے سوالیہ انداز میں اُن کی طرف دیکھا۔

"سرکار، سب نوکروں نے اپنے استعفے داخل کر دیے ہیں۔ اب کوئی یہاں کام کرنے کو آمادہ نہیں۔"

"آخر بات کیا ہے؟" مَیں نے پوچھا۔

"وہ کہتے ہیں کہ مکان پر بدرُوحوں کا سایہ ہے۔ اور اُن کی جانیں خطرے میں ہیں ——— وہ تو اپنی تنخواہیں بھی لینے کو تیار نہیں۔"

مس ٹریلانی کا چہرہ غصّے سے سُرخ ہو گیا، لیکن ضبط کر کے باوقار لہجے میں کہا:

"بہت بہتر۔ جو نوکر نہیں رہنا چاہتا، اُسے فوراً ایک ماہ کی زاید تنخواہ دے کر رُخصت کر دو۔ میری طرف سے بخوشی اجازت ہے کہ جس کا جی چاہے، چلا جائے۔"

مسز گرانٹ یہ حکم پا کر چلی گئیں اور ان کے جاتے ہی مس ٹریلانی کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ مَیں نے آگے بڑھ کر اُنہیں سینے سے لگا لیا۔

عجیب شبہے نرالے شکوک

نوکروں اور خادماؤں کو یُوں رخصت کر دینے کا فیصلہ مسز گرانٹ کو پسند نہ آیا اور مَیں نے بھی دبی زبان سے اس پر احتجاج کیا کہ اگر لوگ جانا ہی چاہتے ہیں تو بڑے شوق سے جائیں، مگر ایک ماہ کی زاید تنخواہ انہیں کس خوشی میں دی جا رہی ہے۔ میرے اس اعتراض پر مارگریٹ نے محبّت آمیز نظروں سے میری جانب دیکھا اور کہا:

"مسٹر رُوز، مَیں آپ کے اس خلوص کی معترف ہوں جو مجھ سے آپ کو ہے، مگر دیکھیے نا، یہ بے چارے مُلازم بھی بے قصور ہیں۔ انہوں نے اتنے عرصے تک اس مکان کے مکینوں کی خدمت کی ہے، اگر اب وہ جانا ہی چاہتے ہیں تو کیوں نہ اُنہیں ہنسی خوشی اور احسان کے ساتھ رخصت کیا جائے ——— مَیں تو یہاں تک تیار ہوں کہ حالات درست ہوتے ہی یہ تمام نوکر اگر واپس کام پر آنا چاہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہو گا۔"

اَب میں کیا بولتا؟ اس لڑکی کی عالی ظرفی پر دل ہی دل میں داد دیتا رہا۔ پھر اس موضوع پر کوئی بات نہ ہوئی۔ چند لمحے تک ہم دونوں لائبریری میں بیٹھے رہے، پھر وہ میز کی طرف گئی اور کاغذ پر نہ جانے کیا لکھتی رہی۔ غالباً اپنی یادداشتیں درج

کر رہی تھی۔ میں نے بھی موٹی سی کتاب اُٹھائی اور مطالعے میں غرق ہو گیا۔ کتاب اتنی دل چسپ تھی کہ وقت گزرنے کا مطلق احساس نہ ہُوا اور نہ یہ پتا چلا کہ مس ٹرِیلانی کب لائبریری سے اُٹھ کر گئیں۔

یکایک لائبریری کا دروازہ آہستہ سے کھلا اور سارجنٹ ڈاڈ کا ستا ہوا چہرہ نظر آیا۔ اس نے مسکرا کر کہا :

"لیجیے، آپ یہاں دھرے ہوئے ہیں اور میں نے ایک ایک کونا کھدرا آپ کی تلاش میں چھان مارا۔"

"خیریت تو ہے ؟ آئیے تشریف رکھیے۔" میں نے جواب دیا۔

"جنابِ والا خیریت ہوتی تو آپ مجھے یہاں دیکھتے ؟" اس نے ہنس کر کہا۔ "ہم پولیس والے بدبخت جاتے ہی وہاں ہیں جہاں خیر و عافیت بالکل نہ ہو۔ بہرحال، میں آپ سے بہت ضروری باتیں کرنے آیا ہوں۔"

"بہت خوب —— فرمائیے، میں ہمہ تن گوش ہوں۔"

سارجنٹ نے پہلے لائبریری روم میں چل پھر کر نہ جانے کیا دیکھا، الماریوں اور پردوں کے پیچھے جھانکتا رہا۔ پھر دروازہ کھول کر باہر برآمدے میں جھانکا اور مطمئن ہو کر دروازہ بند کر دیا۔

"معاف کیجیے مسٹر رُوز، یہ احتیاطیں ہم پولیس والوں کی عادت بن چکی ہیں۔ ویسے بھی آج کل کے لوگوں میں یہ بُری عادت ہے کہ چھُپ کر دوسروں کی باتیں سُنا کرتے ہیں، بہرحال اس وقت کوئی تیسرا فرد نہیں ہے جو ہماری گفتگو سُن سکے۔"

"آہ —— میں سمجھا، آپ غالباً کوئی ایسی بات کرنا چاہتے ہیں جو ہم دونوں تک محدود رہے گی۔"

"بے شک یہی معاملہ ہے۔" سارجنٹ نے کہا۔ "اس مکان میں ایسے انوکھے اور پُراسرار واقعات جنم لے چکے ہیں کہ خدا کی پناہ —— اب ہمیں پھونک پھونک کر قدم رکھنے کی ضرورت ہے۔ مگر اس سے پیشتر کہ میں گفتگو کا آغاز کروں، آپ

وعدہ کریں کہ اس بات چیت سے متعلق ایک لفظ بھی باہر نہ جائے گا۔"

"چونکہ اس معاملے کا تعلق اِس مکان کی مالکہ مس مارگریٹ ٹرِیلانی سے ہے اور میں اُن کا دوست اور ہمدرد ہوں، اس لیے یہ وعدہ کر لیتا ہوں؛ ورنہ میں اِس قسم کے وعدے کرنے کا عادی نہیں ہوں۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"بہرحال بہرحال۔ میں ہر طرح آپ کا شکرگزار ہوں ...." اُس نے ایک لحظہ تامل کے بعد کہا۔ پھر چند لمحے چھت کو گھورنے کے بعد بولا :

"مسٹر رُوز، آپ جانتے ہیں کہ میں بھی اپنا فرض ادا کرنے کے لیے یہاں آیا ہوں اور غالباً یہ بات بھی آپ کے ذہن میں ہو گی کہ ہم سکاٹ لینڈ یارڈ والے جب تک اپنا فرض پوری طرح بجا نہ لائیں، ہمیں تسکین نہیں ہوتی — اور ایک دیانتدار پولیس مین یا سراغ رساں کی حیثیت سے میرا یہ فرض ہے کہ کسی خوف، گھبراہٹ یا غیر جانبداری کے بغیر حقائق کا پتہ چلاؤں اور پریشانیاں دُور کروں۔ اسی لیے میں نے مناسب سمجھا کہ سب سے پہلے آپ سے علیحدگی میں بات کروں، اس کے بعد قدم آگے بڑھاؤں۔"

سارجنٹ نے یہ بات اتنی سنجیدگی سے کہی کہ نامعلوم خوف سے میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی؛ تاہم میں نے اپنی اس گھبراہٹ کا اُس پر اظہار کیے بغیر بے پروائی سے کہا :

"میں سکاٹ لینڈ یارڈ کی اچھی کارکردگی کا معترف ہوں اور خوش ہوں کہ آپ اس مسئلے کو حل کرنے کی سرتوڑ کوشش کر رہے ہیں۔ بہرحال پُورے اطمینان سے گفتگو کیجیے۔ مجھے آپ قابلِ اعتماد ساتھی پائیں گے۔"

"شکریہ، بہت بہت شکریہ۔" سارجنٹ نے گردن جھکا کر کہا۔ "میں اُمید رکھوں کہ اس گفتگو کا کوئی ذکر آپ نہ مس ٹرِیلانی سے کریں گے اور نہ اُن کے والد مسٹر ٹرِیلانی سے —— بشرطیکہ وہ ہوش میں آ جائیں ؟"

"وعدہ کرتا ہوں کہ کسی سے کچھ نہ کہوں گا۔" میں نے کہا۔ "اب آپ میرے

صبر و ضبط کا زیادہ امتحان نہ لیجیے اور بات شروع کیجیے۔"

سرجنٹ کے کھنکار کر گلا صاف کیا، دو تین مرتبہ چہرے سے پسینہ پونچھا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ خود بھی بے حد مضطرب اور پریشان ہے اور اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا کہ گفتگو کیسے اور کہاں سے شروع کی جائے۔ اس دوران مَیں چُپ چاپ بیٹھا رہا۔ آخر اُس نے رُک رُک کر کہا:

"مسٹر رُوذ، مَیں اس بات کی معافی چاہتا ہوں کہ اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے مَیں شاید اپنے اُصل فرائض سے کچھ پرے ہٹ جاؤں۔ مَیں دل سے آپ کی قدر کرتا ہوں اور آپ پر پُورا اعتماد رکھتا ہوں کہ معاملے کو سُلجھانے میں پورا تعاون فرمائیں گے۔ . . . قصّہ یہ ہے کہ اس مکان میں گزشتہ تین روز سے جو واقعات پیش آئے ہیں، مَیں نے اُن کا بڑے غور سے مطالعہ اور مشاہدہ کیا ہے۔ حتیٰ کہ میرے دماغ کی رگیں پُھول گئیں اور رِیڑھ کی ہڈی ٹُوٹنے کا خطرہ پیدا ہو گیا —— اور اب مجھے یہ تسلیم کرنے میں کوئی شرم محسوس نہیں ہوتی کہ مَیں اپنے آپ کو ایک طفلِ مکتب سے بھی کم عقل پاتا ہوں —— مسٹر ڑیلانی پر تین بار رات کی تاریکی میں کسی نے حملہ کیا، مگر سوال یہ ہے کہ حملہ آور ہے کون؟ وہ مکان میں کدھر سے آیا اور کدھر سے گیا؟ حالانکہ ہماری تحقیق کے بعد اس دوران میں باہر سے نہ کوئی آیا نہ کوئی گیا۔ آپ کی کیا رائے ہے؟"

"میری رائے یہ ہے کہ حملہ آور پہلے ہی سے اس مکان میں موجود رہا ہے اور ممکن ہے اب بھی موجود ہو۔"

"بالکل یہی خیال میرا بھی ہے ——" سرجنٹ نے گہرا سانس لیتے ہوئے یوں کہا جیسے سر سے بھاری بوجھ اُتر گیا ہو۔

"مگر جناب، سوال پھر یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ شخص ہے کون اور مکان میں کہاں چُھپا ہوا ہے؟"

"وہ شخص —— یا —— وہ شے ——" مَیں نے آہستہ سے کہا اور سرجنٹ

حیرت سے مجھے گھورنے لگا —— "مَیں سمجھا نہیں آپ کا مطلب۔ آخر وہ "شے" سے آپ کا مقصد کیا ہے؟"

"کوئی بدرُوح . . ." مَیں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"آہ . . . کوئی بدرُوح ——" سرجنٹ نے منہ بنا کر کہا۔ "ممکن ہے آپ کا خیال درست ہو، مگر مصیبت یہ ہے کہ سکاٹ لینڈ یارڈ والے بدروحوں کے وجود تسلیم نہیں کرتے۔ مگر مَیں ضرور کرتا ہوں —— بہرحال یہ بات تو ثابت ہے کہ مسٹر ڑیلانی کی کہنی اور کلائی کو تینوں مرتبہ اُدھیڑنے کا کارنامہ مس مارگریٹ کی پالتو بلّی کا ہے اور اس نے آپ کی کلائی میں بھی پنجہ گاڑ دیا تھا۔ زخموں کے یہ نشان سب ایک جیسے ہیں۔ یہاں تک تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے، مگر یہ راز کسی طرح نہیں کُھلتا کہ آخر ایک معمولی جسامت کی بلّی مسٹر ڑیلانی کو اُٹھا کر کس طرح تجوری تک لے جا سکتی ہے۔ اور پھر اُن کی کلائی سے وہ ننھی سی چابی اتارنے کی کوشش کرتی ہے جو طلائی کنگن میں پھنسی ہُوئی ہے —— ظاہر ہے یہ کام کس فرد کا ہے۔ جیتے جاگتے، گوشت پوست کے بنے ہوئے فرد کا —— جو مجرمانہ ذہنیت کا مالک ہے اور جس نے مکان کی ہیبت ناک فضا سے فائدہ اُٹھا کر یہ ہولناک ڈرامہ کھیلنے کی کوشش کی ہے۔ مگر ابھی تک وہ اپنے مذموم مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکا ہے۔"

"بہت خوب، بہت خوب ——" مَیں نے کہا۔ "سرجنٹ، تمہارا اندازہ ہے کہ وہ فرد کون ہو سکتا ہے؟"

"جی ہاں —— مَیں نے یہ اندازہ لگا لیا ہے اور آپ بھی مجھ سے متفق ہو جائیں گے۔ اچھّا، پہلے ایک سوال کا جواب دیجیے۔ وہ سوال یہ ہے کہ تینوں مرتبہ جبکہ مسٹر ڑیلانی پہ حملہ ہُوا، وہ کون فرد تھا جو سب سے پہلے اُن کے کمرے میں دیکھا گیا۔؟"

مجھے یُوں محسُوس ہوا جیسے کسی نے منوں برف میرے سر پر رکھ دی ہو۔ حیران اور خالی نظروں سے سرجنٹ کی طرف تکنے لگا۔

"خدا کی پناہ، سرجنٹ یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ مگر . . . ."

"جی ہاں، سوچ کر بتایئے وہ فرد کون تھا! کیا مس مارگریٹ ٹریلانی نہ تھیں؟"

"بے شک ہر بار وہی ہمیں وہاں ملی تھیں۔" مَیں نے اقرار کیا۔ "مگر مَیں نہیں مان سکتا کہ اس واردات میں اس معصوم لڑکی کا کوئی ہاتھ ہو سکتا ہے۔"

"جناب، مَیں اُن پر کوئی الزام عائد نہیں کر رہا ہوں۔ مَیں تو صرف واقعات کی ایک ترتیب آپ کے گوش گزار کرنا چاہتا ہُوں۔ پہلی اور دوسری مرتبہ مسٹر ٹریلانی زخمی حالت میں تجوری کے پاس پڑے پائے گئے اور تیسری مرتبہ ایسا نہیں ہُوا، بلکہ آپ نے مس ٹریلانی کو سنبھال کر کمرے سے باہر پہنچایا اور جونہی آپ نے مدد کے لیے پُکارا، ہم لوگ وہاں پہنچ گئے؛ تاہم یہ آپ مانیں گے کہ تینوں مواقع پر مس ٹریلانی اپنے والد کے کمرے میں دیکھی گئیں یا موجود رہیں —— کیا یہ امر دلوں میں بے شمار شک اور شبہے پیدا نہیں کرتا؟"

مَیں نے گردن ہلا کر اقرار کیا کہ بلاشبہ اس سے ذہنوں میں شک اُبھر سکتا ہے۔

دیر تک ہم دونوں خاموش رہے اور ایک دوسرے کی طرف تکتے رہے۔ خود میرے ذہن میں ہل چل برپا تھی۔ اس لیے نہیں کہ مَیں مارگریٹ ہی کو ان وارداتوں کا ذمّہ دار سمجھنے لگا تھا، بلکہ یہ خوف تھا کہ سرجنٹ نے جس طرف اشارہ کیا تھا، کہیں وہ دوسرے ذہنوں میں تو پیدا نہیں ہو رہا۔ اگر یہ بات ہے تو مزید دشواریاں بڑھنے کا امکان تھا۔ اور چونکہ مَیں ایک قانون دان بھی تھا، اس لیے معاملے کی نزاکت کا مجھے پُورا پُورا احساس ہو گیا۔ کیا یہ واقعہ نہیں تھا کہ اگر مسٹر ٹریلانی دنیا سے رُخصت ہو جائیں تو اُن کی کُل جائداد کی وارث یہی لڑکی ہو گی؟ اور کوئی بھی ہوشیار وکیل عدالت میں آسانی سے یہ ثابت کر سکتا ہے کہ مسٹر ٹریلانی کو ہلاک کرنے میں کس فرد کا فائدہ ہے؟ اب سوال یہ تھا کہ مجھے اس موقع پر کیا کرنا چاہیئے؟ مس ٹریلانی

ایک مصیبت میں پھنسنے والی تھیں اور اس سے بالکل بے خبر تھیں کہ حالات اُن کے خلاف کیا رُخ اختیار کر رہے ہیں۔ اُن کی مدد کا بہترین طریقہ فی الحال یہی سمجھ میں آیا کہ مَیں اپنے کان کھُلے رکھوں اور سب کی باتیں سُنتا رہوں —— چنانچہ مَیں نے دِل میں یہی فیصلہ کر کے سرجنٹ ڈاؤ سے کہا:

"آپ نے جس خدشے کا اظہار کیا ہے، مَیں نے اُس کے تمام پہلوؤں پر اچھی طرح غور کر لیا ہے۔ اب مَیں آپ سے عرض کروں گا کہ اپنے فرائض انجام دیجیے اور اگر ہرج نہ ہو تو بتایئے کہ آپ آئندہ کیا کارروائی کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟"

"مَیں نے ابھی کوئی طریقۂ کار طے نہیں کیا ہے۔" سرجنٹ نے کہا۔ "سچ تو یہ ہے کہ میرا دل خود بھی نہیں مانتا کہ مس ٹریلانی کا اس معاملے میں کوئی ہاتھ ہو گا؛ تاہم ان خطوط پر کوئی اور شخص بھی یہی بات سوچ سکتا ہے جو میرے ذہن میں آئی ہے۔ اگر مجھے اس کا یقین ہو جاتا کہ کسی بھی رُخ سے مس ٹریلانی اپنے باپ کو مار ڈالنے کے منصوبے باندھ رہی ہیں تو شاید میں آپ سے مشورہ کیے بغیر ہی کوئی قدم اُٹھاتا، مگر موجودہ صورت میں آپ دیکھتے ہیں کہ مَیں سب سے پہلے آپ کے پاس آیا ہوں۔ آپ مجھ سے کہیں زیادہ بہتر طور پر مس ٹریلانی کو جانتے ہیں —— مَیں یہ بھی صاف صاف کہہ دوں کہ مَیں نے مکان کا چپّہ چپّہ دیکھ ڈالا ہے اور مسٹر ٹریلانی کے کمرے میں بھی گزشتہ دو راتوں سے برابر موجود رہا ہوں؛ تاہم مجھے مس ٹریلانی کے خلاف کسی قسم کا کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ملا ہے۔ اسی لیے مَیں نے اُن سے بات نہیں کی ممکن ہے اس طرح اُن کے دل میں شبہات پیدا ہو جاتے اور ایک لمحے کے لیے فرض کر لیجیے اگر وہ مجرم بھی ہیں، تو یقیناً میری گفتگو کے بعد وہ تمام ثبوت ضائع کرنے کی کوشش کریں گی جو ہمیں کبھی مل سکتے ہیں ——"

"بہرحال میں خوش ہوں کہ آپ نے فرض شناسی اور ذہانت کا ثبوت دیا۔" مَیں نے کہا۔ "اور بڑی صفائی سے تمام باتیں کہہ ڈالیں۔ یقین کر دیں ہر مرحلے پر تمہارے ساتھ ہوں اور اب ہم دونوں مل کر حقیقت ڈھونڈنے کی کوشش

کریں گے ۔ ۔ ۔ ۔"

دفعتہً دروازہ کھلا اور مس ٹریلانی نے کمرے میں جھانکا۔ ہم دونوں فوراً سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔

"آہ — آپ لوگ یہاں ہیں۔" اس نے مترنم آواز میں کہا۔ "معافی چاہتی ہوں کہ آپ کی گفتگو میں مداخلت ہوئی۔" یہ کہہ کر اُس نے واپس جانا چاہا، مگر مَیں نے اُسے روکا اور کہا:

"آپ براہِ کرم اندر آجائیے۔ ہم لوگ ویسے ہی اِدھر اُدھر کی گپ لڑا رہے تھے۔ کوئی خاص بات نہ تھی۔"

اُسی لمحے مسز گرانٹ کا چہرہ نمودار ہوا اور اُس نے مس ٹریلانی سے کہا:

"ڈاکٹر ونچسٹر آپ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں۔"

ہم تینوں لائبریری سے نکلے اور مسٹر ٹریلانی کی خواب گاہ میں داخل ہوئے

ڈاکٹر ونچسٹر مریض پر جھکا ہوا اس کے دِل کی دھڑکن سُن رہا تھا۔ ہمیں دیکھ کر بھی وہ اپنے کام میں مصروف رہا اور چند لمحے بعد فارغ ہوا تو کہنے لگا:

"مریض کی حالت میں کوئی خاص فرق نہیں پڑا ہے۔ بہرحال مَیں آج رات بھی ان کے قریب ہی رہنا چاہتا ہوں۔"

"ڈاکٹر، مَیں آپ کی ان عنایات کا کیسے شکریہ ادا کروں ۔ ۔ ۔ ۔" مس ٹریلانی نے کہنا شروع کیا، مگر ونچسٹر نے اُسے روک دیا اور کہا:

"بیٹی، تم مجھے بار بار شرمندہ کرتی ہو — کیا تمہیں یاد نہیں کہ تمہارے والد میرے بہترین دوست بھی ہیں۔" یہ کہہ کر اُس نے میرا ہاتھ پکڑا اور کمرے سے باہر لے آیا — "آئیے آپ سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔ موقع ہی نہیں مل رہا تھا —"

مَیں چپ چاپ اس کے ساتھ ہو لیا۔

"اب ہم تنہائی میں اطمینان سے گفتگو کر سکتے ہیں" ڈاکٹر نے کہا اور یہ سوچ کر میرا دل

بیٹھنے لگا کہ ڈاکٹر ونچسٹر بھی یقیناً اسی رُخ پر جا رہا ہے جس رُخ پر سارجنٹ ڈاؤ — تاہم میں نے چہرے پر مصنوعی بشاشت پیدا کرتے ہوئے جواب دیا:

"مَیں خود آپ سے علیحدگی میں بات کرنے کا موقع ڈھونڈ رہا تھا۔ اچھا ہوا کہ پہل آپ نے کر دی۔"

ان الفاظ سے ایک لمحے کے لیے ڈاکٹر کا چہرہ روشن ہو گیا۔ آخر اس نے کہا:

"مجھے خوشی ہے مسٹر روز کہ آپ اس گھر کے معاملات میں گہری دلچسپی لے رہے ہیں، مارگریٹ سے آپ کے جو دوستانہ تعلقات ہیں، وہ بھی اسی بات کے متقاضی ہیں کہ آپ اس گھر کو اپنا گھر سمجھیں۔ منہ پر تعریف کرنا ہے تو خوشامد، مگر میں پوری ایمانداری سے سمجھتا ہوں کہ آپ کی موجوگی سے ہم لوگوں کو بڑا سہارا ملا ہے۔ مارگریٹ تو حد درجہ آپ کی ممنون احسان ہے اور مَیں دیکھتا ہوں کہ وہ جب بھی آپ کا نام لیتی ہے تو اس کے کانوں کی لَویں سرخ ہو جاتی ہیں۔ مَیں آپکو دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں مسٹر روز کہ ایسی حسین لڑکی کے دل پر آپ کا قبضہ ہے۔"

مَیں نے شرم سے گردن جھکالی اور کچھ نہ کہا۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد ڈاکٹر نے کہا:

"اس گھر میں گذشتہ دنوں جو کچھ ہوا ہے اس کی ہر تفصیل اور ہر جزو سے آپ بخوبی آگاہ ہیں۔ مَیں ان واقعات کو دہرا کر مزید وقت ضائع نہ کروں گا۔ واقعات اس قدر عجیب اور بعید از فہم ہیں کہ میں جتنا اس پر غور کرتا ہوں اتنا ہی پاگل ہوا جاتا ہوں میرا ذہن مجھے دو ایسے خطوط پر لے جاتا ہے جو اپنی اپنی جگہ بے حد واضح اور نمایاں ہیں مگر بدقسمتی سے یہ خطوط دو مختلف راستوں پر چلتے ہیں۔"

"براہِ کرم وضاحت فرمائیے کہ ان دو خطوط اور دو مختلف راستوں سے آپکا مطلب کیا ہے؟"

"میرا مطلب واضح ہے"۔ ڈاکٹر نے میرے چہرے کو گھورتے ہوئے جواب دیا اور خاموش ہو گیا وہ گہری نظروں سے میرا جائزہ لے رہا تھا۔ شاید میرے دل کے

حالات جاننا چاہتا تھا کہ اس کی اس بات کا مجھ پر کیا اثر ہوا ہے۔ میں نے پوری کوشش کر کے اپنا چہرہ تاثرات سے خالی رکھا، تب ڈاکٹر کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ کہنے لگا:

"وہ خطوط یا داستانوں سے میرا مطلب ہے۔ حقیقت اور وہم۔ حقائق کو دیکھیں تو یہاں جو کچھ ہوا، وہ زیادہ غیر معمولی نظر نہیں آتا۔ رات کی تاریکی میں حملہ ——— نقب زنی یا ڈاکے کی کوشش، قتل کا ارادہ ——— مگر مجرم، وہ جو کوئی بھی ہے، اپنے ان مذموم ارادوں میں کامیاب نہیں ہو پاتا ——— آپ نے خود دیکھا کہ اس وسیع و عریض مکان میں، خادموں کی فوج اور ایک نوجوان لڑکی کے ساتھ ایک مرد شریف رہتا ہے۔ نوکر سب کے سب قابلِ اعتماد اور پرانے ہیں اور یہ بات تصور میں نہیں آسکتی کہ وہ اپنے مالک کو نقصان پہنچانے کا پروگرام بنائیں گے۔ خود مالک کی کیفیت یہ ہے کہ وہ اپنے کام میں جنون کی حد تک دلچسپی رکھتا ہے۔ اس کے پاس بے اندازہ دولت ہے، وہ علم و فضل کا سمندر ہے، اور آہنی قوتِ ارادی کا مالک ——— اسے نقصان پہنچانا یا ان کے منصوبوں میں خلل ڈالنا کسی عام آدمی کے بس کی بات نہیں ہے۔ پھر اس کی نوجوان لڑکی برابر کے کمرے ہی میں سوتی ہے۔ مکان کے باہر سے نہ کوئی نیا آدمی آیا ہے اور نہ چوری چھپے آسکتا ہے حتیٰ کہ مسٹر ٹریلانی کی خواب گاہ میں بھی کسی اجنبی کے آنے کی کوئی علامت پائی نہیں جاتی ——— مگر پھر بھی دو راتیں ان پر حملہ ہوتا ہے اور ہم سے کوئی فردِ مجرم کو اپنی آنکھوں سے دیکھ نہیں پاتا ——— اس کا کوئی سراغ ہمارے ہاتھ میں نہیں آتا نہ کوئی دروازہ کھلا ملتا ہے نہ کوئی کھڑکی ——— حتیٰ کہ معمولی آواز تک نہیں سنائی دیتی۔

"نرس کینیڈی کے اعصاب جواب دے جاتے ہیں۔ سارجنٹ ڈاؤ اپنے پستول سے دو فائر کرتا ہے، مگر گولیاں کسی کو نہیں لگتیں۔ . . . پھر تیسری شب بھی حملہ ہوتا ہے، مگر اس مرتبہ کوئی حادثہ پیش نہیں آتا ——— حالانکہ پورا مکان ہوشیار اور چوکنا ہے۔ خود مالک مکان کے کمرے میں کڑی نگرانی کرنے والے افراد موجود ہیں

سکاٹ لینڈ کا سارجنٹ ڈاؤ بیدار اور چوکس ہے اور پورے مکان میں گھوم رہا ہے اس کے باوجود مسٹر ٹریلانی پر حملہ ہوتا ہے۔ ان تمام حقائق کا جائزہ لینے سے یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ تینوں مرتبہ مس ٹریلانی اپنے والد کی خواب گاہ میں موجود تھیں کیا اسے محض اتفاق سمجھ کر نظر انداز کر دیا جائے؟ میں اس لڑکی کے بارے میں سچ مچ کسی شک و شبے کا اظہار نہیں کر رہا ہوں۔ میں اسے ہر طرح معصوم اور بے گناہ سمجھتا ہوں، مگر یہ بھی تو ممکن ہے کہ کوئی اور فرد اس سے کام لے رہا ہو اور خود لڑکی کو علم نہ ہو کہ وہ کیا کر رہی ہے ——— اب آئیے دوسرے راستے یعنی وہم کی طرف ——— یہ راستہ بھی عجیب و غریب ہے ——— غور کیجئے، پورے مکان میں ہزاروں سال پرانی مصری لاشیں بھری پڑی ہیں۔ ان میں جو مسالے اور خوشبوئیں لگی ہیں، ان سے مکان کی فضا ہمیشہ بوجھل بوجھل سی رہتی ہے پھر مارگریٹ ٹریلانی کی پالتو بلی ہے جو مصری بلی کی ممی دیکھ کر طیش میں آجاتی ہے اور اس پر حملہ کرتا ہے۔ پھر خود مسٹر ٹریلانی کا وجود ایک معمہ ہے، اور ان کی وہ آپ کے نام پُراسرار تحریر ——— اور بے ہوشی ——— آخر یہ سب کیا ہے ——— اس تحریر سے تو یہ احساس ہوتا ہے کہ ان تمام واقعات کا پہلے سے مسٹر ٹریلانی کو علم تھا کہ ضرور رونما ہوں گے ——— بالکل یہی بات ہے ——— ورنہ مسٹر ٹریلانی جیسا جہاں دیدہ اور عقل مند آدمی محض مفروضات کی بنا پر تحریر نہ لکھتا اور نہ مسٹر ماروِن کے نام اپنی وصیت تیار کرتا۔ اس کے پیچھے ضرور کوئی راز ہے، کاش، ہم ایک نظر وہ وصیت نامہ ہی دیکھ سکیں، ممکن ہے اسی کی مدد سے بات واضح ہو

مگر مسٹر مارون اپنے اصول کے پکے ہیں۔ وہ قیامت تک ہمیں وصیت نامہ نہ دکھائیں گے ——— پھر یہ بھی دیکھیے کہ معاملہ پولیس کے نوٹس میں بھی آچکا ہے ——— اور پولیس والے روحوں وغیرہ پر یقین نہیں کرتے۔ انہیں آخر کیونکر مطمئن کیا جائے گا، پھر یہ سوال بھی ہے کہ آخر اس تمام ہنگامے کا مقصد کیا ہے"۔

"کیا آپ کا شبہ کسی پر ہے؟" میں نے پوچھا۔

ڈاکٹر نے حیرت زدہ ہو کر میری طرف دیکھا اور کہا:

"شبہ؟ کس پر؟ مَیں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا؛ تاہم یہ بات طے ہے کہ اس کے پس پردہ کوئی خاص بات ضرور ہے ... مَیں ابھی اس معاملے پر مزید غور کروں گا، اس کے بعد......"

وہ بولتے بولتے دفعتہً رک گیا اور بند دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ مَیں نے بھی اس کی نگاہ کا تعاقب کیا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ دروازہ ہل رہا تھا جیسے باہر سے اسے کوئی کھولنے کی کوشش کر رہا ہو، پھر ہینڈل گھومنے کی تھوڑی سی آواز آئی۔ ایک لمحے کے لیے میرے دل کی دھڑکن تھم گئی — صبح جب میں سرجنٹ ڈاڈ سے باتیں کر رہا تھا، تب بھی دروازہ کھلا تھا اور اب....

یکایک دروازہ کھل گیا اور مارگریٹ کمرے میں آئی۔ جونہی اس نے ہمیں دیکھا ٹھٹھک گئی، اس کے چہرے پر سرخی کی ہلکی سی رو دوڑ گئی۔ چند لمحے تامل کرنے کے بعد اس نے کہا:

"معاف فرمائیے، مجھے علم نہ تھا کہ آپ یہاں بیٹھے ہوئے ہیں۔ مَیں آپ کی گفتگو میں حارج ہوئی، ڈاکٹر! مَیں دراصل آپ کو ہی ڈھونڈ رہی تھی اور پوچھنا صرف یہ ہے کہ کیا آج رات میں آرام کر سکتی ہوں؟ میں بے حد تھکن محسوس کر رہی ہوں اور اگر آج رات بھی جاگ کر کاٹی تو اگلے روز میں یقیناً بیمار ہو جاؤں گی، ویسے بھی آج آپ یہاں ہیں اس لیے مجھے اجازت دے دیجیے کہ اپنے کمرے میں آرام کر لوں —"

"ہاں ہاں بیٹی، جاؤ اور آرام کرو — اس میں بھلا پوچھنے کی کیا بات تھی" — ڈاکٹر ویخٹر نے شفقت بھرے لہجے میں کہا۔ "مجھے خود بھی احساس تھا کہ تم بہت زیادہ تھک چکی ہو اور تمہیں آرام کی ضرورت ہے"۔

یہ سن کر مارگریٹ نے اطمینان کا گہرا سانس لیا، پھر اپنی حسین آنکھیں میری طرف گھمائیں اور کہنے لگی:

"آپ تو آج والد کے کمرے میں رات کو رہیں گے نا؟"

مَیں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ وہ خدا حافظ کہہ کر چلی گئی۔ مَیں نے اُٹھ کر دروازہ بند کر دیا۔ ڈاکٹر ویخٹر اپنے خیالات میں گم تھا — آخر اس نے بڑبڑا کر کہا: "دیکھئے آگے کیا ہوتا ہے"۔

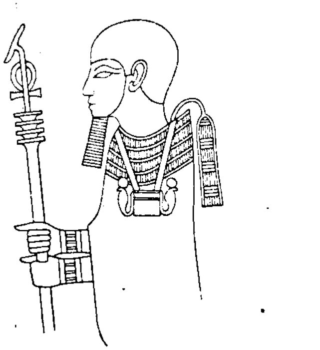

تین چراغ - ایک یاقوت

یہ رات خلافِ توقع بخیر و عافیت کٹ گئی۔ کوئی غیر معمولی واقعہ یا حادثہ رونما نہ ہُوا اور یہ ایک حیرت انگیز بات تھی۔ مس ٹریلانی گذشتہ تین راتوں سے مسلسل جاگ رہی تھیں اور اب اُن کی حالت بتدریج گرتی جا رہی تھی، اس لیے ہم نے مناسب سمجھا کہ چوتھی رات اُنہیں مکمّل آرام کرنے کی ہدایت کی جائے؛ چنانچہ میں نے اور ڈاکٹر ونچسٹر نے اپنی ڈیوٹی کے اوقات بڑھا دیے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ مختلف وقفوں میں نرسیں اور مسز گرانٹ بھی نگرانی کے فرائض ادا کر رہی تھیں۔ خود سارجنٹ ڈاؤ اور اس کے ایک دو نائب بھی اُس رات خاصے چوکنے اور ہوشیار تھے۔ وہ ہر پندرہ منٹ بعد کمرے میں داخل ہوتے، ایک نظر حالات کا جائزہ لیتے اور پھر چُپکے سے باہر نکل کر وسیع و عریض حویلی میں گھومنے لگتے۔ ہم ان کے بھاری جوتوں کی آواز بخوبی سُن سکتے تھے۔

اس طویل مُدّت میں ہمارے پُراسرار مریض مسٹر ٹریلانی کی حالت میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوا تھا۔ وہ اُسی طرح بے ہوش پڑے تھے اور اگر سینے کی ہلکی سی جنبش

نمایاں نہ ہوتی تو کوئی شخص یہ نہ کہہ سکتا تھا کہ مریض زندہ ہے۔ حیرت اس امر پر تھی کہ خون کی اتنی بڑی مقدار ضائع ہونے کے باوجود مسٹر ٹریلانی کا چہرہ سُرخ تھا؛ ورنہ عام طور پر مریض کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد پڑ جایا کرتا ہے۔ اُن کے سانس لینے کی رفتار بھی اس دوران میں یکساں رہی تھی اور اس میں مُطلق کمی بیشی واقع نہ ہوئی تھی ــــ اُس رات بھی میں نے اور ڈاکٹر ونچسٹر نے اُس عجیب اور مدہوش کر دینے والی بُو سے بچنے کے لیے اپنے چہروں پر گیس ماسک چڑھا لیے تھے اور اگرچہ ان کے چڑھانے سے ہمیں سانس لینے میں کسی قدر دِقّت محسوس ہونے لگی تھی، مگر اس احتیاط کے سوا چارہ بھی نہ تھا۔

وہ رات خاصی گرم تھی اور کمرے میں حَبس بھی پھیلا ہُوا تھا۔ بارہا یُوں محسوس ہوا جیسے کوئی اَن دیکھی قوت میرا گلا دبانے کی کوشش کر رہی ہو، لیکن بہت جلد یہ وہم جاتا رہا ــــ یکایک نیچے ہال میں لگے ہوئے کلاک نے تین بجنے کا اعلان کیا اور ہم دونوں زیادہ مُستعد اور ہوشیار ہو کر مریض کی نگرانی کرنے لگے ــــ گذشتہ تین راتوں سے یہی ہو رہا تھا کہ آدھی رات کے بعد سے تین بجنے کے دوران میں کسی وقت مسٹر ٹریلانی پر وہ پُراسرار حملہ ہُوا کرتا تھا اور اسی وقت وہ مدہوش کر دینے والی اور ہمارے اعصاب شل کر دینے والی بُو کمرے میں پھیلا کرتی تھی؛ چنانچہ کلاک نے مدھم آواز میں جونہی تین بجائے، ہم نے آپس میں اشاروں ہی اشاروں سے ایک دُوسرے کو پیغام دیا اور گیس ماسک چہروں پر ٹھیک کر لیے۔

ڈاکٹر ونچسٹر کی کیفیت کیا تھی، یہ تو میں نہیں بتا سکتا؛ البتّہ اپنا حال عرض کرتا ہُوں۔ میرا بدن پسینے میں نہا گیا تھا اور دل کی دھڑکن ہر لمحے تیز ہوتی جا رہی تھی۔ کمرے میں موت کی سی بھیانک خاموشی طاری تھی اور واقعہ یہ ہے کہ ہم ایک دُوسرے کے زور زور سے سانس لینے کی آواز بخوبی سُن سکتے تھے۔

وقت آہستہ آہستہ گزر رہا تھا ــــ ہم اپنی اپنی نشستوں پر بے حس و حرکت بیٹھے تھے۔ کھڑکیوں پر اگرچہ بھاری سیاہ پردے پڑے ہوئے تھے، لیکن اوپری

گوشوں میں سے صبح کاذب اور پھر صبح صادق کی ہلکی ہلکی جھلک صاف نظر آرہی تھی ـــــ اب مکان کے اندرونی حصّوں میں بھی ہل چل شروع ہوگئی تھی سیڑھیوں میں کسی کے اترنے اور چڑھنے اور نچلی منزل کی کسی کھڑکی کے کھلنے کی آواز مجھے صاف طور پر سنائی دی ـــــ پھر سارجنٹ ڈاؤ کے اپنے ساتھیوں سے گفتگو کرنے کی آواز ـــــ اگرچہ وہ سب سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے، مگر میرے زودحس کانوں میں اُن کے منہ سے نکلا ہُوا ایک ایک لفظ بخوبی پہنچ رہا تھا ـــــ دُور کسی کتّے کے بھونکنے کی آواز ـــــ پھر قریبی گلی میں سے کسی مُرغ نے حلق پھاڑ نعرہ لگایا اور یک لخت ڈاکٹر ونچسٹر نے اُٹھ کر کھڑکیوں سے پردے ہٹا دیے۔ مشرقی اُفق سنہری شفق میں ڈوبا ہوا تھا اور یہ روشنی بڑی سرعت سے رنگ بدل رہی تھی۔

مَیں نے خُدا کا شکر ادا کر کے گیس ماسک چہرے سے اتار کر ایک طرف پھینک دیا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ تازہ اور ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں نے میرا استقبال کیا۔ مَیں نے وسیع لان میں جا کر صبح کی نرم ہَوا اپنے پھیپھڑوں میں بھری اور واپس آیا ـــــ اِس دوران میں میری جگہ مسز گرانٹ نے سنبھال لی تھی اور جب میں کمرے میں داخل ہُوا تو ڈاکٹر ونچسٹر نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا:

"صُبح بخیر ـــــ مسٹر مالکم رُوز ـــــ معلوم ہوتا ہے حالات نہایت حوصلہ افزا ہیں۔ مجھے اُمید نہ تھی کہ یہ رات بخیر و عافیت گزرے گی ـــــ"

"جی ہاں ـــــ کچھ یہی خدشہ مجھے بھی تھا، مگر خدا کا شکر ہے کوئی خاص بات نہ ہوئی۔ آپ چاہیں تو آرام کے لیے جا سکتے ہیں۔ مَیں ابھی اپنے پھیپھڑوں میں تازہ آکسیجن بھر کر آیا ہوں اور ابھی کئی گھنٹے ڈیوٹی دے سکتا ہوں۔"

ڈاکٹر ونچسٹر نے پسندیدگی کے اظہار میں گردن کئی بار ہلائی، پھر نرس ڈورس کو طلب کر کے چند ہدایات دیں اور رُخصت ہوگیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک خادمہ ہاتھوں میں ٹرے اُٹھائے کمرے میں آئی اور اُس نے چائے کی دو پیالیاں اور

چند توس پیش کیے۔ ٹھیک آٹھ بجے مس ٹریلانی نمودار ہوئیں ـــــ اور یہ دیکھ کر خوشی سے میرا دِل جھوم اُٹھا کہ اُن کے رخساروں کی آب و تاب لوٹ آئی تھی اور یاقوتی ہونٹوں کا رنگ پہلے سے بھی زیادہ گہرا اور چمک دار ہوگیا تھا۔ ایک رات کی مکمل نیند اور آرام نے اُن کی صحت بالکل بحال کر دی تھی۔

مس ٹریلانی نے اپنی مترنم اور پُرکشش آواز میں صبح بخیر کہا اور اپنے والد کو دیکھنے لگیں۔

"خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ آج رات کوئی حادثہ نہیں ہُوا۔" انہوں نے اطمینان کا سانس لے کر کہا۔

"اور مجھے اِس بات پر خدا کا شکر ادا کرنا ہے کہ آپ کم از کم ایک شب تو آرام کی نیند سوئیں۔" مَیں نے کہا۔

اِس جملے پر مس ٹریلانی کا چہرہ تازہ گلاب کی طرح کِھل گیا اور انہوں نے ایسی محبّت آمیز نظروں سے میری طرف دیکھا کہ مَیں ضبط نہ کر سکا اور اُٹھ کر اُن کا ہاتھ چُوم لیا۔

"مَیں آپ کے اِن پُرخلوص جذبات کی قدر کرتی ہوں مسٹر مالکم روز ـــــ" مس ٹریلانی نے کہا۔ "آپ نے مجھے خرید لیا ہے۔ یقین کیجیے میں اِن احسانات کا بدلہ کبھی نہیں چُکا سکتی۔ بہرحال مَیں دیکھتی ہوں کہ گذشتہ تین راتوں سے آپ مسلسل جاگ رہے ہیں اور آپ کے چہرے کا رنگ اُڑا ہوا ہے۔ بہتر ہے آپ دِن میں آرام فرمائیں۔ میرے ساتھ یہاں دوپہر تک سارجنٹ ڈیوٹی پر حاضر رہے گا۔ مَیں اُس سے بات کر چکی ہوں۔"

"مَیں سرکار کے حُکم کی تعمیل اپنا فرض سمجھتا ہُوں۔" مَیں نے گردن جُھکا کر مؤدبانہ انداز سے کہا۔ وہ کِھل کِھلا کر ہنس پڑیں۔ مَیں دوپہر تک خوب گہری نیند سویا اور ممکن ہے شام تک خوابِ خرگوش میں مدہوش رہتا، اگر مسز گرانٹ دوپہر کے کھانے کے لیے مجھے جگا نہ دیتیں۔ کھانا کھا کر مَیں نے سوچا کہ ذرا جرمن سٹریٹ، اپنے دفتر تک ہو آؤں

اور معلوم کروں کہ کوئی نیا مقدمہ تو نہیں آیا۔ اس ارادے سے صدر دروازے کی طرف چلا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ دربان مورس ایک اجنبی شخص سے تکرار کر رہا ہے۔ نووارد کے چہرے پر ناراضگی اور غصّے کے گہرے آثار نمایاں تھے اور وہ خاصی بلند آواز میں بول رہا تھا، اِس لیے مجھے یہ جاننے میں ذرا بھی دشواری پیش نہ آئی کہ آخر یہ جھگڑا کس بات پر ہو رہا ہے۔ معلوم ہوا کہ اجنبی اِس مکان میں داخل ہونے کی کوشش کر رہا ہے جبکہ دربان دروازہ روکے کھڑا ہے اور اجنبی کو مُہذّب لہجے میں سمجھا رہا ہے کہ وہ کسی اور وقت آئے۔ اجنبی نے کھا جانے والی نظروں سے مورس کو دیکھا اور چلّا کر کہا:

"مَیں تمہاری بات بخوبی سمجھ گیا ہوں۔ اِتنا کُند ذہن نہیں ہوں ... مگر تم بھی تو میری بات سمجھو ——— مَیں کہتا ہُوں مجھے ہر قیمت پر مسٹر ٹریلانی سے ملنا ہے... اور تم ہو کہ راستہ روکے کھڑے ہو۔ مَیں صبح نو بجے آیا، تب تم نے مجھے ٹال دیا اور کہا کہ ابھی مسٹر ٹریلانی بیدار نہیں ہوئے اور چونکہ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، لہٰذا تم انہیں وقت سے پہلے جگا بھی نہیں سکتے۔ پھر میں بارہ بجے آیا، اُس وقت بھی تم نے وہی بات کہی کہ مسٹر ٹریلانی بیدار نہیں ہوئے، ابھی بستر میں ہیں۔ مَیں نے تم سے کہا کہ کیا گھر میں کوئی اور فرد ایسا ہے جس سے مَیں مل سکوں۔ تم نے مس ٹریلانی کا نام لیا، مگر ساتھ ہی کہہ دیا کہ وہ بھی سو رہی ہیں ——— اب میں تیسری دفعہ یعنی تین بجے آیا ہوں اور تم وہی بات کہتے ہو ——— بہرحال یہ بتاؤ مس ٹریلانی کہاں ہیں؟"

"وہ بے شک مکان میں موجود ہیں، لیکن آرام کر رہی ہیں اور انہوں نے سختی سے ہدایت کی ہے کہ انہیں پریشان نہ کیا جائے۔" مورس نے دوٹوک جواب دیا۔

"خدا تم پر رحم کرے ———" اجنبی نے دانت پیس کر کہا۔ "کیسے اُجڈ اور نالائق آدمیوں سے واسطہ پڑا ہے ——— ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میری اِس بکواس کا تُم پر کوئی اثر نہیں ہُوا۔ ارے موذی، راستہ چھوڑ، مجھے اندر جانے دے۔ بخدا تیری وجہ سے پہلے ہی بہت وقت ضائع ہو چکا ہے ———"

"مگر آپ بغیر اجازت ...." مورس نے کہنا شروع کیا۔

"جہنّم میں جاؤ تم اور تمہاری اجازت ...." اجنبی نے کہا اور مورس کو راستے سے ہٹانے کی کوشش کرنے لگا۔ اب مجھ سے رہا نہ گیا اور مَیں نے مداخلت کرتے ہوئے کہا:

"مورس! کیا بات ہے؟ یہ کون صاحب ہیں اور کیا چاہتے ہیں۔؟"

"سرکار، صبح سے انہوں نے ناک میں دَم کر رکھا ہے۔ آئے ہوں گے کسی سکول یا یتیم خانے کے لیے خیرات وبرات لینے کے چکّر میں ——— اس قسم کے آدمی یہاں اکثر آتے رہتے ہیں۔"

مورس کے اِس جملے پر اجنبی کا چہرہ مارے طیش کے سیاہ پڑ گیا۔ چند لمحے تک وہ اُسے گھورتا رہا۔ پھر یک لخت میری طرف مڑا اور ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا:

"معاف کیجئے جناب، اِس سے زیادہ توہین زندگی میں آج تک نہ ہوئی تھی۔ اور یہ سب کچھ مسٹر ٹریلانی کی وجہ سے ہے جو برداشت کر رہا ہُوں ——— بخدا میرے وقت کا ایک ایک لمحہ قیمتی ہے... حد درجہ قیمتی... آہ... مَیں کس طرح اِس بیوقوف دربان کو سمجھاؤں کہ مسٹر ٹریلانی سے میرا ملنا کس قدر ضروری اور اہم ہے۔ مَیں گذشتہ تین برسوں سے مصر کے ریگستانوں میں گھومتا رہا ہوں۔ ایک ایسی چیز کی تلاش میں جس کی مسٹر ٹریلانی کو اشد ضرورت تھی... اور پھر میں نے دن رات کی تگ و دَو کے بعد وہ چیز پالی ——— اور اُسے لے کر گزشتہ شب ہی لندن پہنچا ہوں. لیکن رات رات میں کسی ناہنجار اور بدمعاش نے وہ قیمتی چیز، جس کے سامنے دنیا بھر کے خزانے ہیچ ہیں، میرے کمرے میں سے چُرا لی ہے ——— مجھے اس حادثے کی اطلاع فوراً مسٹر ٹریلانی کے کانوں تک پہنچانی ہے ——— اور یہ بکواسی دربان کہتا ہے وہ سو رہے ہیں... خدا کی پناہ... میرے چھ قیمتی گھنٹے ضائع ہو چکے ہیں اور مسٹر ٹریلانی اصحابِ کہف کی مانند ابھی تک سو رہے ہیں... مَیں کہتا ہوں اگر انہیں علم ہو گیا کہ میرے ساتھ گھر کے دروازے پر یہ سلوک کیا گیا ہے تو نہ جانے وہ

کیا کر بیٹھیں گے ——"

اُس کے لہجے میں ایسا کرب اور ایسی فریاد تھی کہ مَیں متاثر ہوئے بغیر نہ رہ
مَیں نے اُس سے کہا :

"جناب والا، اِس میں بے چارے دربان کا کوئی قصُور نہیں ۔ وہ تو محض
فرض ادا کر رہا ہے اور جو کچھ اُسے حکم دیا گیا ہے۔ اُس کی تعمیل کر رہا ہے ۔ بہر حا
مَیں سمجھتا ہوں کہ اگر کوئی زیادتی ہو گئی ہے تو آپ اسے اپنی اعلیٰ ظرفی کے باع
نظر انداز فرما دیں گے ۔" یہ کہہ کر مَیں نے مورس سے خطاب کیا :

"مورس! تم ان صاحب سے معافی کی درخواست کرو اور اس کے بعد گھر
اور مِس ٹریلانی سے کہو کہ ایک صاحب ملاقات کے لیے تشریف لائے ہیں ۔ ا
مِس ٹریلانی مصروف ہوں، تب مسز گرانٹ سے کہنا کہ وہ آکر ان سے ملیں ۔"

"بہت بہتر جناب ——" مورس نے ادب سے کہا اور اجنبی سے چند
الفاظ کہنے کے بعد مکان کے اندر چلا گیا ۔

"آپ اِدھر تشریف لائیے ——" مَیں نے اجنبی سے کہا اور صدر درواز
کے دائیں جانب واقع برآمدے میں لے گیا ۔ کرسی پر بیٹھ کر اُس نے اُوپر سے
تک میرا جائزہ لیا اور کہا :

"کیا آپ مسٹر ٹریلانی کے سیکرٹری ہیں ؟"

"جی نہیں . . . مَیں صرف اُن کی بیٹی مِس ٹریلانی کا دوست ہوں اور میرا نا
مالکم رُوز ہے ۔"

"مَیں آپ کی اِس نوازش اور کرم کے لیے سراپا سپاس ہوں مسٹر روز . . ." ا
نے کہا ۔ "میرا نام کاربیک ہے ۔ مَیں آپ کی خدمت میں اپنا تعارفی کارڈ پیش ک
مگر جس علاقے سے مَیں آیا ہوں، وہاں کے لوگ بد قسمتی سے تعارفی کارڈ رکھنے
کی تہذیب سے آگاہ نہیں اور فرض کیجئے میرے پاس یہ تعارفی کارڈ ہوتے، تو

گذشتہ رات دوسرے سامان کے ساتھ ہی چوری ہو جاتے . . ."

وہ دفعتہً چُپ ہو گیا اور کچھ سوچنے لگا ۔ اس کی چوڑی پیشانی پر اُبھری ہوئی لکیریں گہرے غور و فکر کا پتہ دیتی تھیں ۔ مَیں نے خاموشی کے اس وقفے سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اس کے سراپا کا جائزہ لیا ۔ قد پستہ، جسم کسی قدر مائل بہ فربہی ۔ گردن بھاری اور موٹی، رنگ گندمی، چہرہ گول، آنکھوں کے نیچے بے شمار جھریاں لیکن پُتلیوں میں بے حد چمک اور ان کا رنگ گہرا سُرخ —— ہاتھوں کی اُنگلیاں سیاہ ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اِس شخص نے زمانے کا بڑا سرد گرم چکھا ہے اور زندگی کے بے شمار عظیم تجربے اپنے سینے میں چھپائے ہُوئے ہے ۔ چہرے کا رنگ اِس امر کا غماز تھا کہ اس شخص کی عُمر کا بڑا حصّہ تپتے ہوئے صحراؤں میں گُزرا ہے —— مَیں اُس کے کاسۂ سر کا ذکر کرنا بھُول گیا ۔ بلا شبہ وہ ایک غیر معمولی بڑے سَر کا مالک تھا ۔ تربوز کی مانند گول سر جو گُدّی کی طرف سے کسی قدر چپٹا تھا ۔ یقیناً اِتنے بڑے سَر میں جو بھیجا ہے وہ بھی معمولی نہ ہو گا —— اس کی ناک لمبی اور طوطے کی چونچ کی مانند نوکیلی تھی جو اس شخص کی طبیعت میں چالاکی اور عیّاری کی گواہ تھی ۔ ٹھوڑی چوڑی اور آگے کو بڑھی ہوئی تھی جس سے پتہ چلتا تھا کہ استقلال اور عزم کا عظیم ذخیرہ اس کے مزاج میں بھرا ہوا ہے ۔ ٹھوڑی کے آس پاس اُلجھی ہوئی چھوٹی سی بھوری ڈاڑھی نے اس کے چہرے کو مزید بارعب بنا دیا تھا ۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ شخص کون ہے اور کس مقصد کے لیے یہاں آیا ہے —— مَیں نے دِل میں سوچا ۔

عین اُسی لمحے مَیں نے اپنے عقب میں قدموں کی آہٹ سُنی ۔ مڑ کر دیکھا مِس ٹریلانی حشر سامانیوں کو اپنے جلو میں لیے آہستہ آہستہ آ رہی تھیں ۔ جونہی مسٹر کاربیک نے انہیں دیکھا، اس کے منہ سے تحیّر آمیز آواز نکلی اور چند ثانیوں کے لیے اس کا منہ کھُلے کا کھلا رہ گیا ۔ مَیں نے محسوس کیا کہ اس کی حالت میں عجیب تغیّر رونما ہو رہا ہے ۔ اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے اور آنکھیں پہلے سے زیادہ چمک دار نظر آتی تھیں ۔ مَیں نے خیال کیا کہ اُدھیڑ عمر کا یہ شخص مِس ٹریلانی کے بے پناہ حُسن سے مرعوب

ہو گیا ہے۔

مس ٹریلانی نے قریب آتے ہی معذرت خواہ لہجے میں کہا :

" معاف کیجیے، آپ کو اتنی زحمت ہوئی —— دراصل والد کی طبیعت کچھ دِن سے ٹھیک نہیں، اس لیے ہم لوگ پریشان ہیں —— مجھے معلوم ہے کہ آپ صبح بھی تشریف لائے تھے، مگر مسٹر مالکم رُوز شہادت دیں گے کہ میں اُس وقت اپنے بیمار والد کے پلنگ کی پٹی سنبھالے بیٹھی تھی اور میرے لیے آپ سے ملاقات کرنا ممکن نہ تھا —— بہرحال آپ فرمائیے، آپ کی آمد کا مقصد کیا ہے اور مَیں آپ کی کیا خدمت بجا لاؤں !"

کاربیک نے زبان کھولنے سے پیشتر کچھ تامّل کیا اور استفہامیہ انداز میں میری طرف دیکھا، گویا مس ٹریلانی سے پوچھ رہا ہو کہ اِس شخص کے سامنے بات کرنے میں کوئی ہرج تو نہیں۔ مس ٹریلانی اُس کی نگاہوں کا مفہوم سمجھ گئیں اور کہنے لگیں :

" جناب، آپ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں، بے دریغ کہیے —— مسٹر مالکم رُوز میرے اِنتہائی قریبی اور عزیز دوست ہیں، بلکہ آپ انہیں میرے تمام معاملات کا رازدار بھی سمجھ سکتے ہیں۔ میرے والد جب سے علیل ہوئے ہیں، مسٹر مالکم رُوز اپنا سب کام کاج چھوڑ کر اِسی مکان میں مقیم ہیں اور تیمارداری کے فرائض میں میرا ہاتھ بٹا رہے ہیں۔ والد تین شب و روز سے مسلسل بے ہوش پڑے ہیں اور اُنھوں نے اِس دوران میں معمولی سی حرکت بھی نہیں کی ہے۔ انہیں ہوش میں لانے کی تمام تدبیریں ناکام ہو چکی ہیں۔ انھیں بعض وجوہ کی بنا پر زیادہ تر تنہا بھی نہیں چھوڑا جا سکتا، اِس لیے آپ سے التجا کروں گی کہ مزید تاخیر نہ کیجیے اور جو کچھ آپ کہنا چاہتے ہیں، بلا تکلّف کہہ ڈالیے —— "

کاربیک ایک منٹ تک مس ٹریلانی کو تکتا رہا۔ آخر اُس نے بولنا شروع کیا اور اس کی زبان سے نکلے ہوئے ہر لفظ نے نہ صرف مجھے، بلکہ مس ٹریلانی کو

بھی مجسمۂ حیرت بنا دیا۔ اس نے بڑے نرم لہجے میں کہا :

" میرا پُورا نام یُوجین کاربیک ہے۔ مَیں نے کیمبرج یونیورسٹی سے ماسٹر آف آرٹس، ڈاکٹر آف لاز اور ماسٹر آف سرجری کی ڈگریاں۔ آکسفورڈ یونیورسٹی سے ڈاکٹر آف لٹریچر، لندن یونیورسٹی سے ڈاکٹر آف سائنس اور ڈاکٹر آف لینگویجز، برلن یونیورسٹی سے ڈاکٹر آف فلاسفی اور پیرس یونیورسٹی سے مشرقی زبانوں میں ڈاکٹریٹ حاصل کی ہے۔ اس کے علاوہ میرے پاس اور کئی یونیورسٹیوں کی اعزازی ڈگریاں بھی موجود ہیں، تاہم مَیں ان کی لمبی فہرست سُنا کر آپ کو مزید پریشان نہ کروں گا۔ مذکورہ ڈگریوں کی فہرست بھی محض آپ کو اس اعتماد میں لینے کے لیے سُنانی پڑی کہ آپ مجھے کوئی جاہل آدمی نہ سمجھیں، بلکہ فوراً بیمار کو دیکھنے کی اجازت دے دیں۔ آپ کے والد میرے پُرانے دوست اور بے حد قدردان ہیں۔ میری اُن سے پہلی ملاقات مصر میں ہوئی تھی جب وہ اور مَیں مِل کر کئی ہزار سال پرانے ایک مقبرے کی کھُدائی کر رہے تھے —— "

نوُوارد نے یہ تمام باتیں اتنی سُرعت اور ایسی تیز رفتاری سے کیں کہ میرا ذہن چکّر کھانے لگا۔ مَیں عقیدت اور حیرت کی نظر سے اِس پست قامت بُڈّھے اور بوسیدہ لباس پہنے عظیم آدمی کو دیکھ رہا تھا جس کے بڑے سے سر میں علوم و فنون کے نہ جانے کتنے بیش بہا اور نادر خزینے دفن تھے۔ مس ٹریلانی اپنی جگہ دم بخود تھیں۔ دیر تک فرطِ استعجاب سے، کوئی کلمہ اُن کے منہ سے نہ نکلا۔ کاربیک نے پھر بات شروع کی :

" مس ٹریلانی، مَیں ایک خاص مشن پر آیا ہُوں اور ایک اہم مقصد کے لیے آپ کے والد سے ملنا چاہتا ہوں۔ مَیں نہ صرف اُن کے تمام ارادوں اور منصوبوں اور مشاغل سے پُوری طرح آگاہ ہوں، بلکہ یوں کہیے کہ ان کا شریکِ کار بھی ہوں۔ دراصل آپ کے والد عرصۂ دراز سے ایک ایسے وجود کی تلاش میں تھے جو دنیا سے کئی ہزار سال پہلے نابُود ہو چکا ہے، لیکن ایک مخصوص علم کے ذریعے دوبارہ دُنیا

میں لایا جا سکتا ہے۔ کیا آپ یقین کریں گی کہ وہ ایسا وجود تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے ؟"

میرا دل سینے میں بیٹھنے لگا۔ معاً مس ٹریلانی کی شیریں آواز گونجی :

" مسٹر کاربیک، کاش! آپ دو دن پہلے آ جاتے۔ بہر حال آئیے، اور خود اپنی آنکھوں سے میرے والد کی حالت دیکھیے۔"

مسٹر کاربیک ہماری رہنمائی سے بے نیاز اس طرح مکان کے مختلف کمروں اور گیلریوں میں سے گزرے جیسے وہ اس کے چپّے چپّے سے آگاہ ہوں۔ پھر وہ آپ ہی آپ مسٹر ٹریلانی کی خواب گاہ کے قریب پہنچ کر رُک گئے۔ کمرے کے اندر سے سارجنٹ ڈاؤ، ڈاکٹر ونچسٹر اور مسز گرانٹ کے باتیں کرنے کی آواز آ رہی تھی۔

" ایسا معلوم ہوتا ہے کچھ اور لوگ بھی موجود ہیں۔" کاربیک نے بڑبڑا کر کہا اور کمرے میں داخل ہو گیا۔ اُس کی آمد اس قدر اچانک تھی کہ کمرے میں موجود دونوں آدمی اور مسز گرانٹ ہڑبڑا کر کرسیوں سے اُٹھ کھڑے ہوئے، لیکن کاربیک ان افراد کی موجودگی سے قطعی بے نیاز سیدھا اُس آہنی پلنگ کی طرف بڑھا جس پر مسٹر ٹریلانی کا بے حس و حرکت جسم پڑا تھا۔ کاربیک کا چہرہ ہر قسم کے تاثر سے خالی نظر آیا، گویا اُسے وہی کچھ دیکھنے کا یقین تھا جو وہ اس کمرے میں دیکھ رہا تھا ——

ایک بھیانک سنّاٹا کمرے کی فضا پر طاری تھا۔ ہر فرد پلک جھپکائے بغیر کاربیک کو دیکھ رہا تھا اور خود کاربیک کی آنکھیں مسٹر ٹریلانی پر جمی ہوئی تھیں۔ پھر اس کے لبوں پر ایک پُراسرار تبسم نمودار ہوا۔ وہ مس ٹریلانی کی طرف مڑا اور یہ الفاظ کہے :

" اب میں تمام واقعہ، شروع سے آخر تک، مکمل جزئیات کے ساتھ آپ

کی زبانی سننے کا خواہش مند ہوں۔" یہ کہہ کر وہ ایک خالی کرسی پر اطمینان سے بیٹھ گیا۔ اس کی غیر معمولی شخصیت کا اثر کمرے میں موجود سبھی افراد نے محسوس کر لیا تھا، اس لیے مزید تعارف کے بغیر مس ٹریلانی نے بے کم و کاست سب ماجرا کہہ سنایا۔ ساری داستان سننے کے دوران میں اُس نے کوئی حرکت کی اور نہ اپنی زبان سے کوئی لفظ نکالا۔ مس ٹریلانی کے خاموش ہوتے ہی وہ کرسی سے اُٹھا اور ایک بار پھر مسٹر ٹریلانی کے سرہانے جا کھڑا ہوا۔ اس مرتبہ جھک کر اُن کے زخمی ہاتھ کا بغور معائنہ کیا، پھر کہنے لگا :

" خواتین و حضرات، آپ کو مسٹر ٹریلانی کے بارے میں کسی قسم کے رنج، تردد یا تشویش کی ضرورت نہیں۔ انہیں اس حادثے کا علم پہلے سے تھا اور وہ اب بھی اپنی حفاظت خود کر رہے ہیں۔ بہر حال میں بھی اس موقع پر اپنا فرض ادا کروں گا۔"

پھر اُس نے محبت سے مس ٹریلانی کے سر پر ہاتھ رکھا اور بولا :

" بیٹی، ہمت سے کام لو . . . . خدا نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا . . . . مجھے ذرا سوچنے دو . . . . میں کل رات ہی یہاں پہنچا ہوں اور میرے آنے کی خبر یہاں کسی کو نہ تھی . . . میں اپنے ساتھ انتہائی قیمتی چیزیں لایا تھا۔ ایسی چیزیں جن کی تلاش میں مجھے کامل تین برس تک دیوانوں کی طرح ایک ملک سے دوسرے ملک میں مارے مارے پھرنا پڑا، وہ تمہارے والد کی فرمائش تھی اور جسے پورا کرنا بہر حال میرا فرض تھا۔ پیاری بیٹی، تم نہیں جانتیں کہ تمہارے باپ کے اور میرے تعلقات کس قدر گہرے ہیں۔ اور یہ بات میں بڑے فخر سے کہہ سکتا ہوں کہ دُنیا بھر میں صرف میں ہی اُن کا گہرا اور بے تکلف دوست ہوں۔ ایسا دوست جس کی نگاہوں سے مسٹر ٹریلانی کی زندگی کا کوئی راز پوشیدہ نہیں ہے۔ بہر حال یہ باتیں پھر کسی وقت پر اُٹھا رکھتا ہوں — ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ آج صبح جب میں بیدار ہوا تو وہ چیزیں میرے پاس نہ تھیں۔ وہ پُراسرار طور

پر غائب ہو چکی تھیں۔ میرا قیام جس جگہ تھا، وہ بڑی محفوظ جگہ ہے اور میرا بستر پر جانے سے پہلے کمرے کا دروازہ اندر سے مقفّل بھی کر لیا تھا۔ میرا یہ کمرہ اُس عمارت کی پانچویں منزل پر ہے؛ لہٰذا کسی شخص کا کھڑکی کے راستے آنے اور جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا؛ تاہم میں نے احتیاطاً کھڑکی بھی اندر سے اچھی طرح بند کر دی تھی؛ کیوں کہ مَیں نہیں چاہتا تھا کہ جو شے میں اپنے ساتھ لندن تک جان کی بازی لگا کر لایا ہُوں، اس کی موجودگی کا ذرا بھی علم کسی اور کو ہو.. مگر اتنی احتیاط اور حفاظت کے باوجود تینوں چراغ غائب ہو گئے ——

"چراغ —— کیسے چراغ ؟" پولیس افسر نے بے چین ہو کر پوچھا۔

"آہ، میرے عزیز... کیا بتاؤں وہ چراغ کیا تھے .... مسٹر ٹریلانی کو اِن چراغوں کی سخت تلاش تھی اور وہ مُدتوں اُن کی تلاش میں سرگرداں رہنے کے باوجود انہیں نہیں پا سکے اور مَیں نے نہ جانے کتنے عظیم خطرے مول لیے اور اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر انہیں پایا، اور اب میں وہی چراغ مسٹر ٹریلانی کو دینے کے لیے لایا تھا... مگر...."

اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور اس نے جُملہ اَدھورا ہی چھوڑ دیا۔

مس ٹریلانی نے کاربیک کے شانے پر ہاتھ رکھا اور کہا:

"آپ مایوس نہ ہوں مسٹر کاربیک، ہم ان چراغوں کو ڈھونڈنے کے لیے لندن کے نہایت ہوشیار اور تجربہ کار جاسوسوں کی ہر قیمت پر خدمات حاصل کریں گے —— سکاٹ لینڈ یارڈ کے مشہور جاسوس سارجنٹ ڈاؤ آپ کے سامنے موجود ہیں ..."

"آہا.... تو آپ ہیں سارجنٹ ڈاؤ ——" کاربیک کے چہرے پر پہلی بار مسرّت کی لہریں نمودار ہوئیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ سارجنٹ کے کارناموں سے بخوبی آگاہ ہے۔ مگر دوسرے ہی لمحے اُس کا چہرہ اصلی حالت پر آ گیا۔ اُس نے مدھم لہجے میں کہنا شروع کیا:

"میرے عزیز دوست، وہ تینوں چراغ بے حد قیمتی ہیں .... بے حد قیمتی.. اس لیے نہیں کہ وہ خالص سونے کے بنے ہوئے ہیں، بلکہ اس لیے کہ وہ زبردست سحر کے حامل ہیں اور اُن کی تاریخی حیثیت ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ انوکھی روایات بھی رکھتے ہیں۔ اگر ان میں سے ایک چراغ گم ہو جائے اور باقی دو ہمیں مل جائیں تب بھی کچھ فائدہ نہ ہو گا۔ اُن تینوں کی موجودگی لازمی ہے —— ممکن ہے کوئی بے وقوف چور سونے کے لالچ میں انہیں اُڑا کر لے گیا ہو اور پگھلا کر سونے کے ڈلے بنانا چاہتا ہو۔ تب یقین کیجیے میری اور مسٹر ٹریلانی کی عمر بھر کی محنت پر نہ صرف پانی پھر جائے گا، بلکہ ہماری جانیں بھی مسلسل خطرے میں گھری رہیں گی۔ مَیں ہر چراغ کے بدلے میں کئی ہزار پونڈ معاوضہ دینے کو تیار ہُوں، لیکن یہ ضروری ہے کہ ان چراغوں کی اصل اہمیت سے کسی کو آگاہ نہ کیا جائے؛ ورنہ..."

"آپ اطمینان رکھیے، ہم یہ راز اپنے سینوں میں امانت کی طرح رکھیں گے۔" سارجنٹ نے سینے پر ہاتھ رکھ کر یقین دِلایا۔

سارجنٹ اُسی وقت چراغوں کی چوری یا گم شدگی کے سلسلے میں ضروری تفتیش کے لیے سکاٹ لینڈ یارڈ کی طرف روانہ ہو گیا۔ پھر مس ٹریلانی نے کاربیک سے کہا:

"کیا یہ بہتر نہ ہو گا کہ اس سے پیشتر کہ آپ کا بچا کھُچا سامان بھی چوری ہو جائے، آپ اس مکان میں قیام فرمائیں۔ مَیں ابھی اپنے کوچبان کو آپ کے ساتھ بھیجتی ہوں۔ وہ سب سامان گاڑی میں رکھ کر لے آئے گا۔"

کاربیک کے لبوں پر معنی خیز مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اُس نے کہا:

"اگر مسٹر ٹریلانی اِس وقت عالمِ بے چارگی میں نہ ہوتے تو شاید مَیں اِس مکان میں ٹھہرنا پسند نہ کرتا، مگر اب .... بہر حال مجھے دوستی کا حق ادا کرنا چاہیے۔ خدا سے دُعا کر دبیٹی، وہ چراغ مل جائیں...."

یہ کہہ کر وہ اُٹھا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ مس ٹریلانی نے مسز گرانٹ کو

کو ہدایت کی کہ کوچبان کو مسٹر کاربیک کے ساتھ بھیجو تاکہ اُن کا سامان یہاں لے آئے۔ ڈاکٹر ونچسٹر نے تھوڑی دیر آرام کی درخواست کی اور وہاں سے چلا گیا۔ اب مَیں اور مِس ٹریلانی وہاں رہ گئے۔

"مسٹر رُوز، سچ پوچھیے تو مسٹر کاربیک کے آجانے سے میرے دل کو بڑی تقویت پہنچی ہے۔" مِس ٹریلانی نے کہا۔ "مجھے ان کے بے پناہ خلوص کا اندازہ ہو چکا ہے اور اب یاد آتا ہے، بہت عرصہ ہُوا، مَیں نے ایک مرتبہ انہیں اپنے والد کے ساتھ دیکھا تھا۔ والد نے جس محبّت اور گرم جوشی سے مسٹر کاربیک کا اِستقبال کیا تھا، وہ منظر بھی کچھ دُھندلا دُھندلا سا میرے ذہن میں ہے۔"

"بے شک مسٹر کاربیک عجوبۂ روزگار انسانوں میں سے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ اُن کا اِس نازک موقع پر نمودار ہونا قدرت کی طرف سے ہماری مدد کا ایک ذریعہ ہے۔" مَیں نے کہا۔ "تاہم میری حیرت اب تک اِس بات پر دُور نہیں ہوئی کہ مسٹر کاربیک نے اتنی یونیورسٹیوں سے بے شمار ڈگریاں کیسے حاصل کیں اور اتنے مطالعے اور تحقیق کا کام سیاحت اور سفر کے دوران انہوں نے کیوں کر کر لیا۔"

"اِس میں حیرت کی کون سی بات ہے مسٹر رُوز ——— ابھی آپ کی گفتگو میرے والد سے نہیں ہوئی؛ تبھی آپ کو مسٹر کاربیک اور میرے والد کے عِلم و فضل کا صحیح اندازہ ہو سکتا تھا۔"

ہم تھوڑی دیر تک اسی موضوع پر گفتگو کرتے رہے۔ اس کے بعد خاموش ہو گئے۔

اَب مَیں نے غالباً پہلی بار دن کی روشنی میں اِس وسیع و عریض خوابگاہ کو غور سے دیکھا جس میں ہزاروں چیزیں مختلف کونوں، گوشوں، الماریوں اور دِیواروں پر سجی ہوئی تھیں۔ یہ وہ چیزیں تھیں جو مصر میں پُرانے مقبروں کی کھدائی کے دوران میں مسٹر ٹریلانی یا کاربیک کے ہاتھ لگی تھیں۔ ان میں سے ہر شے بیش قیمت اور اپنی ایک تاریخی حیثیت رکھتی تھی، لیکن افسوس کہ ان پر لکھی ہوئی

تحریروں کو پڑھنا میرے بس کی بات نہ تھی۔ یہ تحریریں کیا تھیں بے شمار چھوٹی چھوٹی تصویریں تھیں ———

دفعتہً میری نظر مسٹر ٹریلانی کے پلنگ سے کچھ فاصلے پر رکھے ہوئے ایک تابوت پر پڑی۔ اس پر سیاہ رنگ کا ایک غلاف سا چڑھا ہُوا تھا اور بادی النظر میں یُوں معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی بڑا صوفہ یا دِیوان ہے ——— مَیں نے اِس غلاف کو سرکایا تو تابوت کے آثار دِکھائی دیے۔ مَیں نے حیرت سے دیکھا کہ یہ خاصا بڑا تابوت تھا اور سیاہ رنگ کے کسی نادر پتھر سے بنایا گیا تھا اور تعجّب کی بات یہ تھی کہ اس کے ڈھکنے کے سوا، اور کہیں کوئی جوڑ نہ تھا۔ تابوت پر اُبھرے ہوئے بے شمار رنگین نقش و نگار یُوں چمک رہے تھے جیسے مُصوّر انہیں بنا کر ابھی ابھی فارغ ہُوا ہو ——— دِل چسپ بات یہ تھی کہ تابوت کو سبز پتّھر کے ایسے پایوں نے سہارا دے رکھا تھا جن پر سُرخ رنگ کی باریک دھاریاں سی پڑی ہوئی تھیں۔ بالکل اِنسانی جسم کی رگوں اور شریانوں جیسی لکیریں، جن میں بلاشُبہ تازہ خون دوڑتا ہُوا نظر آتا تھا۔ بلاشبہ یہ مصوّر کا کمالِ فن تھا۔ پایوں کا نچلا حِصّہ جو فرش پر ٹِکا تھا، گیدڑ کے پنجوں سے ملتا جُلتا تھا اور ہر پائے پر سنہری رنگ کا ایک ایک مصنوعی اژدہا لپٹا ہوا تھا۔ یہ مصنوعی اژدہے، جن کے مُنہ خوفناک انداز میں کُھلے تھے، خالص سونے کے بنے ہوئے تھے۔ جب میں نے اور مِس ٹریلانی نے قریب سے اس تابوت کو دیکھا تو حیرت اور کسی قدر خوف کی اِنتہا نہ رہی۔ ان نقوش کے اندر چمکنے والی چیز رنگ دار مسالہ نہ تھا، بلکہ اِن میں نہایت قیمتی اور نادر ہیرے جڑے ہوئے تھے۔ یاقوت، زمرّد، نیلم، لعل اور نہ جانے کس کس رنگ اور کس کس قسم کے موتی۔ مَیں نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا:

"جس تابوت کی ظاہری حالت اتنی شاندار ہے، اس کے اندر رکھی ہوئی شے کی قیمت کا اندازہ کرنا واقعی دشوار ہو گا۔ خدا کا نام لے کر مَیں اسے کھولتا

ہوں۔ کیا آپ نے کبھی دیکھا کہ اس تابوت کے اندر کیا ہے؟"

"دیکھا تو نہیں؛ البتہ والد نے ایک مرتبہ بتایا تھا کہ اس میں ایک ایسی چیز بند ہے جس کے آگے دُنیا کے تمام خزانے اور نادر اشیا ہیچ ہیں۔ یہ سُن کر میں نے ضد کی کہ ایسی چیز تو میں ضرور دیکھوں گی، مگر والد نے سرد آہ بھر کر کہا؛ نہیں بیٹی، ابھی اسے دیکھنے کا وقت نہیں آیا ... میں تمہیں کسی روز یہ تابُوت کھول کر دکھا دوں گا ... بشرطیکہ زندہ رہا ... یہ کلمات سُن کر میں خوف زدہ ہو گئی اور پھر میں نے کبھی ضد نہ کی ——"

مجھے مسٹر ٹریلانی کی وہ ہدایات یاد تھیں جو اُنہوں نے خط کے ذریعے اپنی بیٹی کو دی تھیں۔ ان میں ایک ضروری ہدایت یہ بھی تھی کہ اس خواب گاہ سے باہر نہ کوئی شے لے جائی جائے نہ کسی شے کی جگہ تبدیل ہو، لیکن اس بات کی ممانعت تو نہ تھی کہ ان اشیاء کو کوئی فرد دیکھ بھی نہیں سکتا؛ چنانچہ میں نے یہی سوچ کر مِس ٹریلانی سے کہا:

"میں اس تابوت کو کھول کر دیکھنا چاہتا ہُوں کہ اس میں آخر ہے کیا۔"

میرا خیال تھا مجھے اس کی اجازت ہرگز نہ ملے گی، مگر مِس ٹریلانی نے خندہ پیشانی سے کہا:

"مسٹر رُوز، آپ اس گھر کے مالک ہیں۔ جو جی چاہے دیکھیے، لیکن اُن ہدایات کی روشنی میں جو میرے والد دے چکے ہیں۔"

"اس کی آپ فکر نہ کیجیے، میں کسی شے کو نہ کمرے سے باہر لے جاؤں گا اور نہ اس کی جگہ تبدیل کروں گا۔"

تابوت کھولنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئی؛ تاہم میں نے محسوس کیا کہ میرے ہاتھ پسینے سے تر ہو گئے ہیں اور دل کی دھڑکن میں ہر لحظہ اضافہ ہو رہا ہے۔ میں اس تابوت کے اندر وہ چیز دیکھنے والا تھا جس کے آگے، بقول مسٹر ٹریلانی، دنیا بھر کے خزانے ہیچ اور حقیر ہیں۔

سیاہ تابوت ایک جھٹکے سے کھُلا اور مِس ٹریلانی نے ہلکی سی چیخ مار کر اپنی لمبی انگلیاں میرے بازو میں گاڑ دیں۔ میں دَم بخود اپنی جگہ کھڑا تھا، لیکن کیفیت اصل میں یہ تھی کہ اگر اُس وقت کوئی مجھے قتل بھی کرنا چاہتا تو میں اپنی مدافعت میں انگلی تک نہ ہلا سکتا تھا۔ جسم کا سارا خون کھنچ کر میرے سینے میں جمع ہو گیا تھا۔

تابوت میں ایک انتہائی خوب صورت نوجوان لڑکی کی لاش —— حنوط کی ہوئی —— رکھی تھی۔ اس کے کھلے چہرے پر اتنی چمک دمک تھی کہ آنکھ نہ ٹھہرتی تھی۔ یہ لاش سُرخ اور سبز رنگ کی جھلملاتی ہوئی نہایت نرم ریشم کی پٹیوں میں جکڑی ہوئی تھی۔ اس کے بدن کے ہر حصے پر چاروں طرف جواہرات اور سونے کے نازک زیورات کا ڈھیر لگا تھا۔ یہ کسی مصری ملکہ یا شہزادی کی لاش تھی جسے مرے ہوئے نہ جانے کے ہزار برس گزر چکے تھے، مگر یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ابھی ابھی دنیا سے رُخصت ہوئی ہے۔ اس کے یاقوتی ہونٹوں پر نہایت غم انگیز تبسّم کھیل رہا تھا، لیکن جس چیز نے ہمیں بیحد خوف زدہ کیا، وہ اس شہزادی کا دایاں کٹا ہوا ہاتھ تھا جو اس کے سینے پر دھرا تھا۔ یہ خوب صورت ہاتھ جس کی کھال ابھی تک دُودھ کی مانند سفید تھی، کلائی کے پاس سے کاٹا گیا تھا۔ اُس جگہ بھُورے رنگ کا ایک بڑا سا دھبّا بھی نظر آیا جو یقیناً جما ہُوا خون تھا۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ پنجۂ دست میں پانچ کے بجائے سات اُنگلیاں تھیں۔ سات اُنگلیاں —— اور ہر اُنگلی اتنی حسین اور نازک کہ گھنٹوں دیکھتے رہیے، مگر طبیعت نہ بھرے؛ البتہ ان اُنگلیوں کے سِروں پر جو ایک اِنچ لمبے اور ترشے ہوئے نوک دار ناخن تھے، اُنہیں دیکھ کر بدن پر لرزہ طاری ہوتا تھا۔

"خدا کے لیے اسے بند کر دیجیے۔" مِس ٹریلانی نے کانپتے ہوئے کہا اور ابھی میں تابُوت کا ڈھکنا بند کرنے ہی والا تھا کہ دروازہ کھُلا اور مسٹر کاربیک اور سارجنٹ ڈاؤ کمرے میں داخل ہوئے۔ دوسرے ہی لمحے مسٹر کاربیک کی نظریں تابوت میں لیٹی ہوئی شہزادی کی لاش اور اس کے کٹے ہوئے ہاتھ پر پڑیں۔

اس کا منہ حیرت سے کھل گیا اور آنکھوں سے انتہائی دہشت جھلکنے لگی۔

"خدا کی پناہ، یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں۔" وہ چلّایا۔ "اسے فوراً بند کر دیجئے۔"

وہ بُری طرح ہانپ رہا تھا اور اتنی دیر میں اس کا پھولا ہوا چہرہ پسینے سے تر ہو چکا تھا۔

میں نے تابوت فوراً بند کر دیا۔ اب ہم سب سوالیہ انداز میں مسٹر کاربیک کی طرف تک رہے تھے۔ آخر مس ٹریلانی نے کہا:

"کیا آپ ہمیں اس ممی کے بارے میں کچھ بتائیں گے یہ کون ہے اور یہاں کیسے لائی گئی تھی؟"

"میں سب کچھ بتاؤں گا میری بچّی... سب کچھ... لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ گم شدہ چراغ مل جائیں۔ مجھے ابھی ابھی سارجنٹ نے بتایا ہے کہ ان کی بازیابی بہت دشوار، بلکہ ناممکن ہے۔ سراغ رسانوں نے اس کمرے کا ہر طرح معائنہ کیا ہے اور ان کا خیال ہے کہ وہ چراغ کوئی انسان وہاں سے نہیں لے جا سکتا، ضرور یہ کسی بھوت کا کام ہے —— بہرحال.... میرا ذہن تو جواب دے گیا ہے —— خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اب ہمارا کیا حشر ہونے والا ہے۔"

پھر وہ مسٹر ٹریلانی کی طرف بڑھا اور اُن کے زخمی بازو کا معائنہ کرنے لگا۔

"اُف، کیا میرا دست یُونہی پڑا رہے گا... یُونہی..." اس کے اضطراب میں ہر لمحہ اضافہ ہو رہا تھا۔ وہ آپ ہی آپ دیوانوں کی طرح باتیں کر رہا تھا۔ "نہیں... ایسا نہیں ہو سکتا... مجھے ہر صورت میں ان چراغوں کو ڈھونڈنا ہو گا... ہر صورت میں ان چراغوں کو ڈھونڈنا ہو گا... ہر صورت میں۔"

ہم سب حیران و پریشان اور کسی قدر خوف زدہ حالت میں اپنی اپنی جگہ کھڑے تھے کہ دفعتہً مس ٹریلانی کی پالتو بلّی دبے پاؤں کمرے میں داخل ہوئی اور ایک ہولناک چیخ مار کر مصری بلّی کی ممّی پر ٹوٹ پڑی وہ اپنے نوکیلے پنجوں اور

دانتوں سے اُسے اُدھیڑ رہی تھی بلی کو بڑی مشکل سے قابو میں کیا گیا، لیکن وہ اُس وقت تک غرّاتی اور چیخے مارتی رہی جب تک اُسے کمرے سے باہر نہ بھیج دیا گیا۔

کاربیک نے یہ منظر نہایت حیرت اور توجّہ سے دیکھا، پھر وہ مصری بلّی کی اُدھڑی ہوئی ممی کے قریب گیا اور اس کے پنجوں کا معائنہ کرنے لگا۔ اسکی آنکھیں یکایک چمک اُٹھیں:

"اب میں سمجھا معاملہ کیا ہے؟" اُس نے جیسے اپنے آپ سے کہا۔

یکایک کمرے میں ایک روشنی سی پھیل گئی۔ میں نے دیکھا کہ کاربیک نے مصری بلّی کی ممی کے پیٹ میں سے کوئی چیز نکالی اور ہماری نگاہوں کے سامنے کر دی۔ یہ دہکتے ہوئے کوئلے کی مانند سُرخ اور انتہائی چمک دار بہت بڑا یاقوت تھا جسے بھونرے کے جسم کی صورت میں تراشا گیا تھا۔ کاربیک اِس یاقوت کو پا کر جیسے پاگل ہو گیا۔ وہ بار بار اُسے دیکھتا اور خوشی سے ناچنے لگتا۔ چند لمحوں بعد وہ اپنے آپے میں آیا اور ہم سے مخاطب ہو کر بولا:

"یہ ہے وہ یاقوت جو ملکہ تارا کے گلے میں لٹکا رہتا تھا اور وہ اسے حاصل کرنے کے لیے بے چین تھی۔ اور اب مجھے یقین ہے کہ وہ چراغ بھی اسی نے غائب کیے ہوں گے۔ جو بہت جلد مجھے مل جائیں گے۔ کیونکہ یاقوت میرے قبضے میں ہے۔"

اُس نے انگلی سے تابوت کی طرف اشارہ کیا جس میں شہزادی کی لاش بند تھی۔ پھر باری باری یاقوت سب کو دکھایا۔ بلاشبہ یہ نادرِ روزگار یاقوت تھا۔ تین انچ لمبا، دو انچ چوڑا اور آدھا انچ دبیز —— اس پر دبِ اکبر کی طرح سات ستاروں کے نقش کھدے ہوئے تھے اور ان ستاروں میں سے روشنی کی تیز شعاعیں پھوٹتی نظر آتی تھیں۔ میں نے جونہی اسے چھوا، مجھے حرارت کا احساس بھی ہوا۔

اب کاربیک نے تابوت کھولا۔ ایک بار پھر شہزادی کی حسین و جمیل صورت ہمارے سامنے تھی۔ کاربیک نے وہ پُراسرار یاقوت ملکہ کے کٹے ہوئے ہاتھ سے لگایا، اور ہم سب نے حیرت سے دیکھا کہ یاقوت میں سے تیز روشنی کی کرنیں پھوٹنے لگیں۔ ان کرنوں کا رُخ مشرقی گوشے میں رکھی ہوئی آبنوس کی الماری کی طرف تھا۔ کاربیک مسکرایا اور تابوت بند کرنے کے بعد مس ٹریلانی سے کہنے لگا:

"غالباً یہ دیدہ زیب الماری وہی ہے... بالکل وہی... مَیں پوچھتا ہوں اس الماری میں کیا ہے؟ ذرا اسے کھولو تو؟"

اور اس سے پیشتر کہ ہم میں سے کوئی شخص کچھ کہہ سکے، مسٹر کاربیک نے آگے بڑھ کر الماری کے دروازے کھول دیے۔ اس کے اندر لکڑی کا ایک چھوٹا صندوقچہ رکھا تھا۔ کاربیک نے اس صندوقچے کو ہلایا۔ اس میں سے ایسی آواز نکلی جیسے برتن آپس میں ٹکرا رہے ہوں۔ دوسرے ہی لمحے صندوقچے کا ڈھکنا کھل چکا تھا اور سونے کے بنے ہوئے تین چراغ جگمگاتے اور جھل مل جھل مل کرتے ہمارے سامنے تھے۔

"میرے چراغ... میرے چراغ..." کاربیک چلّایا اور پاگلوں کی طرح ان چراغوں کو سینے سے لگا کر رقص کرنے لگا، لیکن اُس کی یہ حالت زیادہ دیر تک نہ رہی۔ چند لمحوں بعد وہ سنجیدہ ہو گیا۔

"معاف کرنا عزیزو، مَیں اپنی مسرت پر قابو نہ پا سکا۔"

اس مرحلے پر سارجنٹ ڈاڈ نے زبان کھولی اور شک و شبہے سے لبریز لہجے میں کہا:

"پروفیسر کاربیک، کیا آپ کو پورا یقین ہے کہ یہ وہی چراغ ہیں جو آپ کی قیام گاہ سے غائب ہوئے تھے؟"

"بالکل، بالکل ـــــ مجھے اس طرح یقین ہے جس طرح اس حقیقت کا یقین

کہ کل سورج نکلے گا۔ ایسے چراغ دنیا بھر میں کہیں اور نہ ملیں گے۔" پروفیسر نے جواب دیا۔

"مگر... ممکن ہے برٹش میوزیم میں ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ تینوں چراغ اصلی ہوں اور مسٹر ٹریلانی کی ملکیت ہوں اور آپ جن چراغوں کے گم ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، وہ نقلی ہوں ـــــ کیا آپ کے پاس اپنے چراغوں کی شناخت کا کوئی ثبوت موجود ہے؟"

اِس جرح پر کاربیک کا چہرہ مارے طیش کے سُرخ ہو گیا اور اُس کے ہونٹوں کے کناروں سے جھاگ اُڑنے لگا۔ اُس نے کھا جانے والی نگاہوں سے سارجنٹ کی طرف دیکھا اور گرج کر کہا:

"تمہیں کس گدھے نے پولیس افسر بنا دیا ہے مسٹر ڈاڈ؟ افسوس، مَیں کن جُہلا میں آن پھنسا۔ یہی بات تم مسٹر ٹریلانی کے سامنے کہتے تو مجھے یقین ہے وہ تمہارا مُنہ توڑ دیتے۔ ارے احمق آدمی، تو کہتا ہے میرے چراغ نقلی ہوں گے اور ممکن ہے برٹش میوزیم میں بھی مل جائیں، اور یہ کہ میرے پاس ان کی شناخت کا ثبوت کیا ہے؟ تو مجھ سے سوال کرتا ہے ـــــ اُس شخص سے، جس نے کامل تین برس ان چراغوں کی تلاش بے آب و گیاہ صحراؤں اور دہشت انگیز ویرانوں کی خاک چھانی ہے اور اپنی جان پر کھیل کر انہیں حاصل کیا ہے۔ ان چراغوں کو غور سے دیکھ اور بتا یہ نقش و نگار اور عبارتیں جو تجھے نظر آتی ہیں، کیا دوسرے چراغوں پر بنائی جا سکتی ہیں؟ مَیں پورے تین ماہ تک خردبین سے ان کا مطالعہ کرتا رہا ہوں اور مجھے معلوم نہیں کہ یہ چراغ اصلی ہیں یا نقلی؟ تو برٹش میوزیم کی بات کرتا ہے۔ وہاں تو خاک ڈھول بھی نہیں ـــــ ارے بے وقوف! مَیں نے دُنیا بھر کے عجائب خانے دیکھے ہیں اور بخدا ایسی نایاب چیز کہیں نہیں... کہیں نہیں... ہاں، سکاٹ لینڈ یارڈ میں ہوں تو کچھ عجب نہیں۔"

آخری جملہ اس نے طنزیہ مسکراہٹ سے ادا کیا اور مَیں نے دیکھا کہ مارے ندامت

کہ بے چارے سارجنٹ کا بُرا حال تھا۔ اس کے بعد پروفیسر کاربیک کا علم و فضل جوش میں آیا اور اُس نے ڈیڑھ گھنٹے تک ان چراغوں کے بارے میں تقریر کی اور ان کی پانچ ہزار سالہ قدامت اور تاریخ پر ایسی تفصیل سے روشنی ڈالی کہ سبھی اُس کی بے پناہ معلومات پر عش عش کرنے لگے۔

ممکن ہے پروفیسر کاربیک اپنی یہ دلچسپ اور حیرت انگیز تقریر جاری رکھتا کہ ایک عجیب واقعہ پیش آیا، اور سب سے پہلے میں نے اس کا نوٹس لیا۔ بے ہوش مسٹر ٹریلانی کے جسم میں ہلکی سی تھرتھری نمودار ہوئی اور دوسرے لمحے انہوں نے آنکھیں کھول دیں۔ پھر انتہائی حیرت کے آثار ان کے چہرے پر اُبھرے اور اُنہوں نے کسی قدر سخت لہجے میں کہا:

"آپ لوگ کون ہیں اور میرے اس پرائیویٹ کمرے میں کیا کر رہے ہیں؟"

بیک وقت سبھی نے گھوم کر اُس طرف دیکھا جدھر سے یہ پُراسرار آواز آئی تھی۔ آہ، وہ لمحہ ——— میں اُسے الفاظ میں کس طرح بیان کروں! حیرت، خوف، تجسس، مسرت اور اضطراب کی بے پناہ لہریں ہم سب کو بہا کر لے گئیں۔ مس ٹریلانی کے حلق سے ہلکی سی چیخ نکلی اور وہ اپنے باپ سے لپٹ گئی۔ یہی کیفیت کاربیک کی ہوئی۔ اس کا چہرہ خوشی سے سُرخ ہو گیا اس نے کہا:

"خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے، آپ ہوش میں آ گئے۔"

"آہ، میرے دوست کاربیک، تم بھی یہاں موجود ہو... مگر تم کب آئے؟ کیا وہ کام ہو گیا جس کے لیے میں نے تمہیں بھیجا تھا؟"

"جی ہاں، ہو گیا ———"

"خوب، بہت خوب۔" مسٹر ٹریلانی نے اطمینان سے اُٹھ کر کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ پھر میری اور سارجنٹ ڈاؤ کی جانب استفہامیہ نظروں سے دیکھ کر بولے:

"آپ حضرات کی تعریف ———"

تب مارگریٹ نے مختصر الفاظ میں ساری داستان کہہ سنائی۔ مسٹر ٹریلانی غور سے سُنتے رہے۔ اُن کا چہرہ ہر قسم کے تاثرات سے یکسر خالی تھا۔ جب مارگریٹ اپنا بیان ختم کر چکی تو مسٹر ٹریلانی کے لبوں پر مسکراہٹ نمایاں ہوئی۔ انہوں نے محبت سے میرا ہاتھ پکڑا اور کہا:

"عزیز دوست، میں آپ کا حد درجہ شکر گزار ہوں ——— اور یقین کیجیے میں آپ سے مل کر بہت خوش ہوا ہوں۔ اگر آپ آج یہیں قیام فرمائیں، تو میں کچھ باتیں آپ سے کروں گا اور وہ باتیں یقیناً ایسی ہوں گی کہ اس معاملے کے بعض پوشیدہ پہلو آپ کی سمجھ میں آ جائیں گے اور عین ممکن ہے آگے چل کر مجھے ایک عظیم مہم سرانجام دینے میں آپ کی مدد کی ضرورت پڑے، بشرطیکہ آپ مجھ پر اور میری بیٹی پر مزید احسان کرنا پسند فرمائیں۔"

"جناب، میں نے صرف اپنا فرض ادا کیا ہے، آئندہ بھی دل و جان سے ہر ممکن خدمت کے لیے حاضر ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

مسٹر ٹریلانی کے یک لخت بیدار ہو جانے سے گھر بھر میں خوشی کا ایک طوفان آ گیا اور یوں محسوس ہونے لگا جیسے سارا معاملہ ہی ختم ہو چکا ہے۔ سارجنٹ ڈاؤ سکاٹ لینڈ یارڈ چلا گیا تاکہ نئی رپورٹ تیار کر کے پیش کر دے اور اطمینان کا سانس لے ——— اس دوران میں مسٹر ٹریلانی نے مجھ پر خاص توجہ کی اور دیر تک باتیں کرتے رہے۔ آخر میں اُنہوں نے کہا:

"میں تمہارے لیے ایک عمدہ کتاب رات کو کھانے کے بعد اپنی لائبریری سے نکال لوں گا۔ اگر تم اسے پڑھ لو تو واقعات کا ایک تسلسل تمہارے سامنے آ جائے گا۔ اس کے بعد مزید کارروائی ہو گی۔"

"بہت خوب ——— میں وہ کتاب پوری دلچسپی سے پڑھوں گا" میں نے جواب دیا۔

اس کے بعد انہوں نے کاربیک کو اپنے کمرۂ خاص میں بُلایا اور دروازہ بند کر لیا۔

حیرت انگیز سفر نامہ

آرام کرسی پر اطمینان سے بیٹھ کر میں نے برقی لیمپ روشن کیا اور میز پر رکھی ہوئی کتاب اٹھائی جو تھوڑی دیر پہلے مسٹر ڈیلانی نے مسز گرانٹ کے ہاتھ بھیجی تھی۔ کتاب کے اوراق خاصے بوسیدہ تھے اور چھپائی پرانی۔ یہ کسی شخص کا سفر نامہ تھا جو اس نے ولندیزی زبان میں لکھا تھا۔ ۱۶۵۰ء میں اس کا انگریزی ترجمہ کسی انگریز نے کیا اور ایمسٹرڈم میں چھپوایا۔ اصل ولندیزی عبارت کے نیچے انگریزی ترجمہ تھا۔ ابتدا میں قدیم انگریزی پڑھنے میں سخت دقّت ہوئی، لیکن جوں جوں مطالب واضح ہوتے، دل چسپی بڑھتی گئی اور آدھ گھنٹے بعد میں دنیا و مافیہا سے بے خبر اس کتاب میں گم ہو چکا تھا۔

کتاب کے دیباچے سے ظاہر ہوا کہ اس سفر نامے کا مصنّف ایک ولندیزی سیّاح نکولس فان ہیون ہے اور مصر کا یہ سفر اس شخص نے جان گریوز کی کتاب "اہرامِ مصر" کے مطالعے کے بعد کیا۔ جان گریوز انگریز تھا اور مصر کے قدیم آثار کی تحقیق اور مطالعے کے فن میں اپنے دَور کا سب سے بڑا عالم۔ "اہرامِ مصر" پڑھنے کے بعد نکولس فان ہیون کے دل میں مصر کی سیاحت اور پرانے مقابر اور اہرام دیکھنے کا شوق چرّایا؛ چنانچہ اس شخص نے کمرِ ہمّت باندھی اور چل پڑا۔ اسوان کے

مشرقی علاقے میں پھرتا پھراتا وہ ایک عجیب اور پُراسرار مقام پر پہنچا اور یہیں سے دراصل اس کا انتہائی خوفناک سفر شروع ہوتا ہے۔ بہتر یہ ہے کہ میں اسی کے الفاظ میں آغاز کروں۔

"شام کا وقت تھا۔ سورج کا آتشیں گولہ تیزی سے مغرب میں جھک رہا تھا۔ ہمارے اونٹ آہستہ آہستہ قدم اٹھا رہے تھے اور میں کسی مناسب جگہ پہنچ کر ڈیرے ڈالنے کے لیے بے چین تھا۔ یکایک ہمارا کارواں ایک وسیع و عریض وادی میں داخل ہوا۔ یہ وادی مشرق تا مغرب حدِّ نظر پھیلے ہوئے پہاڑی سلسلے کے درمیان واقع تھی۔ یہ پہاڑیاں بالکل بے آب و گیاہ اور چٹیل تھیں۔ ہر طرف بے کراں اور ہیبت ناک سناٹا طاری تھا۔ میں نے غروب ہوتے ہوئے سورج کی طرف نگاہ کی اور آگے آگے جانے والے مصری ساربان کو آواز دے کر کہا:

"یہاں سے جلد نکل چلو، ورنہ رات اسی جگہ ٹھہرنا پڑے گا۔"

پھر میں نے مڑ کر اپنے عقب میں آنے والے دو اور ساربانوں سے بھی یہی الفاظ کہے، لیکن جواب دینے کے بجائے وہ خاموش رہے اور پھر انہوں نے اپنے اونٹوں کا رُخ پھیرا اور ایک جگہ جمع ہو گئے۔ میں حیرت اور غصّے کی نظر سے انہیں دیکھ رہا تھا۔

"کیا بات ہے... آگے کیوں نہیں بڑھتے؟" میں نے چلّا کر کہا۔

"جناب، ہم آگے نہیں جائیں گے۔" ان میں سے ایک ساربان نے، جو زیادہ عمر کا تھا، آہستہ سے جواب دیا اور اپنے اونٹ کو بٹھا دیا۔ اس کی دیکھا دیکھی دوسروں نے بھی اپنے اپنے اونٹ بٹھا دیے۔ میری سمجھ میں نہ آیا ان لوگوں کو یک لخت کیا ہو گیا ہے۔ آخر اس سے پہلے بھی تو یہ میرے ساتھ سینکڑوں میل کا سفر کرتے ہوئے یہاں تک آئے ہیں۔ راستے میں انہوں نے کوئی ایسی حرکت نہ کی تھی۔

"یہ ٹھہرنے کی جگہ نہیں ہے" میں نے کہا۔ "سورج چھپ رہا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ رات ہم اس وادی کے پار گزاریں۔"

"جناب، ہم آگے نہیں جائیں گے۔" اس مرتبہ تینوں نے یک زبان ہوکر جواب دیا۔

"کیوں؟"

اس "کیوں" کا کوئی جواب اُن کے پاس نہ تھا، لیکن میں نے فوراً اندازہ کرلیا کہ وہ سہمے سہمے سے ہیں اور بار بار خوف زدہ نظروں سے وادی کی طرف دیکھ رہے ہیں۔

"کیا تمہیں اس وادی میں داخل ہوتے ہوئے ڈر لگتا ہے؟" میں نے پوچھا "کیا نام ہے اس وادی کا؟"

"جناب، ہم کچھ نہیں جانتے۔" معمّر ساربان نے جواب دیا۔ "صرف اتنا معلوم ہے کہ ہمارے آباؤاجداد نے رات کے وقت اس میں داخل ہونے سے منع کیا تھا.... ہم اس وادی کا نام بھی نہیں جانتے.... ہم نے سنا ہے کہ یہاں کوئی "جادوگر" رہتا ہے۔"

میں نے ان بے وقوفوں سے جرح کرنی مناسب نہ سمجھی اور وادی کے سرے ہی پر ڈیرے ڈال دیے۔ رات بڑی تاریک اور سرد تھی۔ میں اپنے کمبل میں لپٹ کر سوگیا، لیکن تینوں ساربان جاگتے رہے۔ انہوں نے خلافِ عادت نہ آگ جلائی اور نہ کچھ کھایا پیا۔ غالباً اُن پر "جادوگر" کی ہیبت طاری تھی اور غنودگی کے عالم میں مجھے یہ بھی سنائی دیا کہ وہ زیرِ لب اپنی عربی زبان میں کچھ پڑھ رہے ہیں (اگلے روز مجھے انہوں نے بتایا تھا کہ وہ قرآن کی آیتیں تلاوت کر رہے تھے) رات کو جس وقت بھی میری آنکھ کھلی، میں نے انہیں آگ کے پاس بیٹھے اور بڑبڑاتے ہی پایا اور اسی طرح آخر کار صبح ہوگئی۔ مشرق کی طرف سے پو پھٹی اور پھر سورج نے اپنا چمکدار چہرہ دکھایا۔ رات بھر سردی میں ٹھٹھرے ہوئے ساربان جھٹ پٹ اُٹھ کھڑے ہوئے

اور اپنے اونٹوں کی طرف دوڑے۔ اُنہوں نے مجھے ناشتہ بھی نہ کرنے دیا اور کہنے لگے کہ وہ دِن دِن میں اس وادی کو پار کرکے "محفوظ" علاقے میں پہنچ جانا چاہتے ہیں۔ میں چونکہ ان کے رحم وکرم پر تھا اور زیادہ بحث کرنے یا دھمکانے سے یہ خدشہ بھی تھا کہ وہ مجھے چھوڑ کر چل نہ دیں، اس لیے چپ چاپ اپنے اونٹ پر سوار ہوکر اُن کے ساتھ ہولیا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ غیر معمولی رفتار سے اپنے اونٹوں کو دوڑا رہے ہیں اور اُن میں سے کوئی بھی شخص پیچھے رہنا پسند نہیں کرتا۔ نتیجہ یہ کہ وہ آگے نکل گئے اور میں اُن کے عقب میں خاصا پیچھے رہ گیا۔

ٹھیک دوپہر کے وقت ہم ستانے کے لیے ایک جگہ رُکے۔ میرے چاروں طرف چٹیل پہاڑیاں ہی پہاڑیاں تھیں یا ریت کے بڑے بڑے تودے۔ کہیں کہیں جانوروں کے ڈھانچے بھی پڑے دکھائی دیے۔ پورا منظر اور ماحول اتنا عجیب اور پُراسرار کہ سورج کی روشنی میں بھی اپنے آپ کو اس ماحول میں گھرا ہوا پاکر خوف سا لگتا تھا۔ تینوں ساربان خلافِ معمول خاموش تھے اور اُن پر سراسیمگی سی طاری تھی۔ میں جان گیا کہ خوف کی یہ حالت کسی سبب کے بغیر نہیں اور زبانیں کھلوانے کا واحد طریقہ یہی تھا کہ انہیں چمکتے سکّوں کی جھلک دکھائی جائے؛ چنانچہ میں نے اپنے بٹوے میں سے چاندی کے چند سکّے نکالے اور اُن سے کھیلنے لگا۔ ساربان مجھے حیرت سے دیکھتے رہے۔ پھر میں نے اُن کی للچائی ہوئی نگاہوں سے بھانپ لیا کہ وہ یہ سکّے ضرور لے لیں گے۔ یکایک میں نے کہا:

"تم میں سے جو شخص مجھے اس وادی اور جادوگر کے بارے میں سچ سچ بتا دے گا، میں یہ سکّے اُسی کو دے دوں گا۔"

یہ سُن کر تینوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ آخر سب سے معمّر ساربان آگے بڑھا اور سرگوشی کے لہجے میں بولا:

"جناب یقین کیجیے ہمیں کچھ معلوم نہیں.... ہم نے اپنے آباؤاجداد سے سُنا تھا کہ اس وادی میں آج سے ہزاروں، لاکھوں برس پہلے کسی ملکہ کی لاش دفنائی

گئی تھی۔ وہ ملکہ اپنی زندگی میں بھی بڑی عظیم تھی۔ لوگوں پر اُس کی ہیبت تھی، وہ اُسے پوجتے تھے... پھر ایسا ہوا کہ ملکہ کے شوہر نے اُسے زہر دے دیا... اس کا ہاتھ کاٹ ڈالا... وہ مر گئی اور اُسے اس وادی میں کسی جگہ دفن کر دیا گیا... لیکن لاکھوں برس گزر گئے، وہ ابھی تک مصریوں سے ناراض ہے۔ وہ بڑی جادوگرنی ہے... اور جو کوئی اِدھر سے رات کی تاریکی میں گزرتا ہے، اُسے مار ڈالتی ہے... کبھی زندہ نہیں چھوڑتی۔"

دوسرے ساربان اس کی تائید میں گردنیں ہلا رہے تھے۔

"کیا تم میں سے کسی نے اُس کا مقبرہ دیکھا ہے؟"

"نہیں جناب... کبھی نہیں... اِدھر تو صدیوں سے کوئی نہیں آیا... اب یہ سکّے مجھے دیجیے اور یہاں سے جلد نکل چلیے۔ سُورج چھُپنے کے بعد یہاں رُکنا خطرے سے خالی نہیں... وہ ہم سب کا گلا گھونٹ کر مار ڈالے گی۔"

آخری جُملہ ادا کرتے ہوئے معمّر ساربان فرطِ خوف سے کانپنے لگا اور سچ تو یہ ہے کہ میرے بدن پر بھی ہلکی سی کپکپی ضرور طاری ہوئی، تاہم میں نے مصنوعی قہقہہ لگا کر کہا: "ڈرو نہیں، میں بھی بہت بڑا جادوگر ہوں۔ وہ میری موجودگی میں تم پر حملہ کرنے کی جرأت نہ کرے گی۔"

چند لمحے سستانے کے بعد ہم وہاں سے چلے اور ابھی بمشکل دو تین میل ہی گئے ہوں گے کہ جنوب کی جانب ایک بلند اور عمودی چٹان سب چٹانوں سے الگ تھلگ کھڑی نظر آئی۔ اس چٹان میں ایسا وقار اور دبدبہ تھا کہ بس اسے دیکھنے کے لیے رُک ہی گیا اور پھر یکایک ایک نئے انکشاف کے باعث میرا دل اندر ہی اندر اُچھلنے لگا۔ یہ پوری چٹان، جو میرے اندازے کے مطابق تین سو فٹ بلند تھی، ایک دیوقامت مصری عورت کی شکل میں ڈھلی ہوئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ صدیوں کی گردشِ لیل و نہار نے اپنے نادیدہ ہاتھ سے چٹان کی تراش خراش کر کے عورت کے ایک حسین لیکن بارُعب مجسّمے میں تبدیل کر دیا ہے۔

مجھے رکتا دیکھ کر ساربانوں نے بھی اپنے اپنے اُونٹ روک لیے اور پھر اُن کی نظریں بھی اس چٹان پر پڑیں۔ میں نے دیکھا، ان کی حالت میں ایک عظیم تغیّر رونما ہُوا۔ انہوں نے جلدی سے اپنے اونٹ بٹھائے اور زمین پر کُود کُود کر اُوندھے مُنہ لیٹ گئے پھر زور زور سے عربی زبان میں چلّانے اور رونے لگے۔ وہ بار بار ہاتھوں سے میری جانب اشارہ بھی کرتے جاتے تھے۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ انہیں یکلخت کیا ہو گیا ہے اور اس سے پیشتر کہ میں اُن کے قریب جا کر کچھ پوچھوں یا ہمت بندھاؤں، وہ تینوں دوبارہ اونٹوں پر سوار ہو کر اس برق رفتاری سے بھاگے کہ آناً فاناً نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ ایک لمحے کے لیے مجھے اس ویران اور پُرہول صحرا میں تنہائی کا احساس ہُوا اور دل جیسے بیٹھنے لگا۔ میرا اُونٹ بھی بلبلاتا اور اچھل پھاند کر رہا تھا اور اگر اس کی نکیل میرے ہاتھ میں نہ ہوتی، تو یقیناً وہ بھی مجھے چھوڑ کر اپنے ساتھی اُونٹوں کے نقشِ قدم پر چل پڑتا۔ اس عجیب و غریب چٹان کو قریب سے دیکھنے کی حسرت دل میں لیے میں بھی اُسی طرف روانہ ہوا جدھر وہ تینوں ساربان گئے تھے، لیکن نہ معلوم زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا، پھر میں نے اُنہیں دوبارہ نہ دیکھا۔

شام کے وقت میں اس تنگ وادی سے نکل کر ایک چھوٹی سی بستی کے قریب پہنچا۔ یہاں عرب بدّوؤں نے عارضی پڑاؤ ڈال رکھا تھا۔ میں ابھی اپنے بھگوڑے ساربانوں کو تلاش کر ہی رہا تھا کہ میری ملاقات عرب بدّوؤں کے سردار سے ہوئی جسے اُسکے ساتھی شیخ ابوصُوما کہہ کر پکارتے تھے۔ میں نے تھوڑی دیر کی گفتگو کے بعد ہی اندازہ کر لیا کہ یہ عرب شیخ، مصریوں کی نسبت کہیں زیادہ نڈر اور منچلا ہے۔ اگر میں اسے اپنے ساتھ دوبارہ وادی میں لے جاؤں، تو اُس چٹان کو اچھی طرح دیکھ سکوں گا۔

میں نے شیخ صُوما سے اس چٹان کا ذکر کیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ اتنی جلدی راضی نہ ہوگا، مگر چٹان کا ذکر سُنتے ہی اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اُس نے جوش میں آ کر میرے شانے پر ہاتھ مارا اور کہنے لگا:

"میں تمہارے ساتھ ضرور چلوں گا... میں مصریوں کی طرح بُزدل اور بھگوڑا

نہیں ہوں .... میں نے ایک بہادر ماں کا دُودھ پیا ہے اور ایک نڈر باپ کا خون میری رگوں میں گردش کرتا ہے۔" پھر اُس نے ہلال نما چمکدار خنجر اپنی کمر سے نکال کر فضا میں لہرایا اور نعرے لگاتا ہُوا اپنے ساتھیوں کے پاس چلا گیا۔

اُس رات میں شیخ صُوما کا مہمان رہا۔ اگلے روز سُورج کی پہلی کرن نکلتے ہی شیخ نے اپنے تین ساتھیوں کو بلوایا اور حُکم دیا کہ اپنے اپنے اُونٹ تیار کرلیں، ابھی ایک جگہ جانا ہے۔ شیخ کے ساتھی بھی ویسے ہی نڈر اور بے پروا سے لوگ تھے۔ کچھ پُوچھے بغیر کہ کہاں جانا ہے، چلنے کے لیے فوراً آمادہ اور تیار ہوگئے۔ ایک بار پھر میں دھڑکتے دل کے ساتھ اس پُراسرار وادی کی طرف جا رہا تھا، اُس چٹان کو دیکھنے کے لیے جو دُور سے عورت کا دیو قامت مجسّمہ نظر آتی تھی۔

جب تک میرے عرب ساتھی اور اُن کا شیخ وادی میں داخل نہیں ہوئے تھے، اُن کا جوش و خروش اور چستی قابلِ تعریف تھی، لیکن جونہی اُن کے اونٹوں نے وادی کی زمین پر قدم رکھے، وہ آپ ہی آپ خاموش ہوگئے اور ہیبت زدہ نظروں سے گردوپیش دیکھنے لگے۔ خود میری کیفیت بھی یہی تھی۔ نامعلوم خوف اور دہشت کے باعث جسم کا ایک ایک رونگٹا کھڑا تھا اور جوں جوں ہم اس چٹان کے نزدیک پہنچ رہے تھے، خوف کی فضا تیزی سے ہمیں اپنی لپیٹ میں لے رہی تھی۔ میں نے اونٹوں کی حالت میں بھی عجیب تغیّر محسوس کیا۔ کہاں تو وہ شوخی کہ آپس میں دوڑیں لگاتے تھے اور کہاں یہ سُستی و پژمردگی کہ گردنیں جھکائے، نہایت ادب سے قدم رکھتے آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہے تھے۔

اب میں بڑی اچھی طرح دیکھ رہا تھا کہ یہ چٹان، جس کا رنگ امتدادِ زمانہ کے باعث سیاہ پڑ چکا تھا، قدرت کے نادیدہ ہاتھوں نے تراش کر عورت میں تبدیل نہیں کی، بلکہ یہ انسانی ہاتھوں کا کارنامہ ہے —— ایک عظیم اور لافانی کارنامہ —— اس پر بے شمار تصویریں بنی ہوئی تھیں اور لاتعداد عبارتیں جو میرے فہم و شعور سے بالا تھیں۔ یہ چٹان نہیں تھی، کسی مصری بادشاہ یا ملکہ کا شاندار اور پُرشکوہ ہرم تھا

اور اس کی عمر یقیناً اُن تین اہرام سے بھی کہیں زیادہ تھی جو دُنیا کے سات عجائبات میں سرِفہرست ہیں۔ ہرم کی تین دیواریں، جو بڑے بڑے پتھروں سے بنائی گئی تھیں، بالکل سپاٹ اور عمودی تھیں؛ البتہ چوتھی طرف اُوپر چڑھنے کے لیے سیڑھیاں سی بنی ہوئی دکھائی دیں جن پر ہزارہا برس سے گرد کی دبیز تہ جم گئی تھی۔ ہم نے بڑی مشکل سے ریت ہٹا ہٹا کر راستہ بنایا اور اُوپر چڑھنے لگے۔ عرب آپس میں چُپکے چُپکے باتیں کر رہے تھے۔ اَب اُن کا خوف دُور ہو چکا تھا اور وہ سونے اور جواہرات کا عظیم خزانہ پانے کی اُمید میں تیزی سے اُوپر چڑھ رہے تھے۔

ڈیڑھ گھنٹے کی جان توڑ اور انتہائی جدّوجہد کے بعد ہم اس ہیبت ناک چٹان کی چوٹی پر پہنچ گئے اور فوراً ہی مقبرے کا دروازہ نظر آیا۔ پتھر کی تراشی ہوئی ایک بہت بڑی سِل تھی جس نے مقبرے کا دروازہ بند کر رکھا تھا۔ اس سِل پر بھی بے شمار نقش و نگار اور رنگین تصویریں بنی تھیں۔ ان تصویروں کے رنگ ابھی تک چمکدار اور تازہ تھے۔ ہم سب نے پُوری جسمانی طاقت صرف کر کے کئی مَن وزنی سِل کو ایک جانب اتنا سرکا دیا کہ اندر جانے کا راستہ بن جائے۔ اب ایک لمبی اور تاریک سُرنگ ہمارے سامنے تھی جس میں سے عجیب سی بدبُو آنے لگی۔ مقبرے کے اندر اگرچہ سُورج کی روشنی پہنچ رہی تھی؛ تاہم وہاں اب بھی اتنا اندھیرا تھا کہ ہم آسانی سے گردوپیش کی اشیاء دیکھ نہیں سکتے تھے؛ چنانچہ ایک بار پھر دروازے پر رکھی ہوئی سِل کو ہٹانے کی کوششیں کی گئیں، حتّیٰ کہ ہمارے سانس پھُول گئے اور پیٹ دھونکنی کی مانند حرکت کرنے لگے —— وزنی سِل ایک ڈیڑھ فٹ اور سرک گئی۔ اب ہم اندرونی منظر بخوبی دیکھ سکتے تھے۔

پہلے شیخ صُوما سرنگ میں داخل ہُوا، پھر اس کے تین ساتھی، میں ان کے عقب میں تھا۔ سُرنگ میں قدم رکھتے ہی ایسا معلوم ہُوا جیسے زمین نے میرے پیر پکڑ لیے ہیں اور کوئی نادیدہ قوت مجھے پیچھے دھکیل رہی ہے۔ ایک لمحے کے لیے میرے حواس جواب دے گئے، مگر فوراً ہی مَیں نے ہمّت کر کے شیخ کو آواز دی۔ جواب میں اُس

کی آواز کسی گہرے کنوئیں سے آتی ہوئی سنائی دی۔ وہ سُرنگ میں نہیں تھا۔ میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ دائیں بائیں دیواروں پر چمکدار رنگ و روغن سے بنی ہوئی تصویریں نظر آئیں۔ ان میں سُرخ رنگ زیادہ روشن تھا اور لہو کی طرح گیلا گیلا۔ یہ تصویریں پتھروں پر کھُدی ہوئی تھیں اور بیل، شیر، لومڑیاں اور مگرمچھ بنائے گئے تھے۔ ان کے علاوہ انسانی کھوپڑیاں اور اجسام تھے۔ مجھے یوں محسوس ہُوا جیسے یہ تمام تصویریں آہستہ آہستہ زندہ ہوتی جا رہی ہیں اور حرکت میں ہیں۔ بائیں ہاتھ پر ایک بڑا مگرمچھ اپنا غار سا مُنہ کھولے بیٹھا تھا اور دائیں ہاتھ ایک قوی ہیکل شیر اس انداز میں جھپٹ رہا تھا جیسے مقبرے میں داخل ہونے والے ہر شخص کو ہڑپ کر جائے گا۔ شیر کی آنکھیں سُرخ تھیں اور جبڑا کھُلا ہوا۔ اس کے لمبے نوکیلے سفید سفید دانت دیکھ کر میرے بدن میں جھرجھری سی دوڑ گئی۔ میں اس بزدلی پر آپ ہی آپ ہنس دیا۔ یہ محض تصویریں ہیں، میرا کیا بگاڑ سکتی ہیں۔

سُرنگ کچھ زیادہ لمبی نہ تھی اور اگر میں پہلے ہی باخبر اور ہوشیار نہ ہوتا تو یکلخت اس تاریک گڑھے میں ضرور گر جاتا جو مجھ سے صرف ایک فٹ کے فاصلے پر تھا۔ اسی گڑھے میں سے عربوں کی گونجتی ہوئی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ میں نے رُک کر غور سے دیکھا۔ چار پانچ سنگین سیڑھیاں اُتر کر ایک وسیع چوکور تہ خانہ تھا جس میں کسی نامعلوم لیکن نہایت چمکدار پتھر کے بنے ہوئے دو تابوت پڑے تھے۔ ویسے ہی تابوت جن میں حنوط شدہ لاشیں رکھی جاتی ہیں۔ ممیوں کے تابوت میں پہلے بھی کئی جگہ دیکھ چکا تھا، لیکن اس مقبرے میں پڑے ہُوئے یہ دونوں تابوت اپنی نرالی ہیئت اور پتھروں کے رنگ کے باعث اتنے عجیب اور خوبصورت تھے کہ الفاظ ان کا حُسن بیان کرنے سے قاصر ہیں۔ ان میں سے ایک تابوت بڑا اور سیاہ چمکتے ہوئے پتھر کا بنا ہوا تھا اور دُوسرا ذرا چھوٹا اور سبز پتھر کا تھا۔

عرب شیخ اور اس کے ساتھی تصویرِ حیرت بنے ایک گوشے میں کھڑے تھے۔ میں اُن کے نزدیک پہنچا، دیکھا وہ خاصے خوف زدہ ہیں اور کسی کو تابوت کھولنے

کی جرأت نہیں ہو رہی۔ بڑا تابوت مینڈک کی شکل کا تھا اور اس پر بھی لاتعداد نقش و نگار، رنگین تصویریں اور عبارتیں کندہ تھیں جن کی لکیروں اور قوسوں سے روشنی کی کرنیں سی پھوٹتی نظر آتی تھیں۔ اب میں نے تابوت کو اور قریب سے دیکھا اور پھر دہشت سے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ چار پایوں نے تابوت کو فرش سے کسی قدر اُونچا اُٹھا رکھا تھا۔ پائے سبز پتھر کے تھے، لیکن ان پر بہت باریک سُرخ سُرخ دھاریاں سی چمکتی نظر آتی تھیں۔ پایوں کا نچلا حصّہ گیدڑ یا لومڑی کے پنجوں کی مانند تھا اور ہر پائے پر سنہری رنگ کا ایک اژدھا لپٹا ہُوا تھا۔ ان اژدھوں کی آنکھیں سُرخ تھیں۔ تابوت کے نقش و نگار میں سے روشنی پھوٹنے کی وجہ وہ ہیرے جواہرات تھے جو ان نقوش کے اندر جڑے گئے تھے۔ دوسرا چھوٹا تابوت خوبصورت ہونے کے باوجود پہلے تابوت کے پاسنگ بھی نہ تھا۔

حیرت، خوف اور خوشی کا وہ عظیم اور یادگار لمحہ صدیوں، اَن گنت صدیوں پر محیط تھا۔ میرا دل بَلّیوں اُچھل رہا تھا اور ہاتھ پیر کانپ رہے تھے۔ نہ جانے اس تابوت میں کیا ہے؟ ممّی یا کچھ اور؟ یکایک شیخ صوما نے جھرجھری لی اور جارحانہ انداز میں بڑے تابوت کی طرف بڑھا اور اس سے پیشتر کہ میں اُسے روکوں، وہ دونوں ساتھیوں سمیت تابوت کا ڈھکنا کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجھے اس وقت قطعاً یاد نہیں کہ ان دو تابوتوں کے علاوہ مقبرے کے اندر اور کیا کیا چیزیں پڑی تھیں، البتّہ اتنا احساس ضرور ہے کہ وہ وسیع و عریض تہ خانہ بے شمار اشیاء سے پُر تھا۔ میں نے شیخ صوما کے ہاتھ میں لوہے کا ایک ہتھوڑا دیکھا جو وہ اپنے ساتھ تھیلے میں چھُپا کر لایا تھا۔ منع کرنے کے باوجود اُس نے بڑے تابوت کا ڈھکنا توڑنے کے لیے ہتھوڑا چلایا، لیکن ہتھوڑے کی ہر ضرب بے کار اور بے سود ثابت ہُوئی۔ نہ جانے یہ پتھر کتنا مضبوط اور بھاری تھا کہ اُس پر ہلکی سی خراش بھی نہ آئی۔ میرے سوا باری باری بقیہ عربوں نے بھی اُسے توڑنا چاہا، مگر ناکام رہے۔ تب میں نے اُنہیں ایک طرف ہٹا کر تابوت کو نیچے اُوپر اور دائیں

بائیں خوب غور سے دیکھا۔ یقیناً اسے کھولنے کا کوئی نہ کوئی طریقہ اس کے بنانے والے نے ضرور مقرر کیا ہوگا۔ اس کی ساخت سے بھی یہی اندازہ ہوتا تھا کہ تابوت کا ڈھکنا قوت سے نہیں، حکمت سے کھلے گا۔

اسی معائنے کے دوران میں نہ معلوم میری انگلی کس جگہ لگی کہ ایک ہلکی سی گڑگڑاہٹ سے تابوت خود بخود کھل گیا اور پھر میں اور میرے عرب ساتھی اپنی چیخیں روک نہ سکے۔ ان چیخوں میں خوف کے بجائے مسرت زیادہ نمایاں تھی۔ اس میں ایک طویل قامت اور نہایت حسین و جمیل عورت کی لاش رکھی تھی لیکن مصریوں کے قدیم طریقے کے مطابق حنوط نہیں کیا گیا، بلکہ سبز اور سرخ رنگ کے چمکدار ریشمی لبادوں میں لپیٹ دینا ہی کافی سمجھا گیا۔ عورت کے جسم پر کوئی زیور نہ تھا، لیکن چہرے مہرے سے صاف اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کوئی عالی نسب خاتون ہے یا ممکن ہے کسی دور میں مصر کی ملکہ رہی ہو۔ تابوت کے اندر بھی قدیم مصری رسم الخط میں باریک باریک عبارتیں نقش تھیں۔ کاش! میں یہ عبارتیں پڑھ سکتا۔ یہ خوبصورت عورت، جس کے یاقوتی لبوں پر ایک غم انگیز مسکراہٹ طاری تھی، نہ جانے کتنے ہزار سال سے محوِ خواب تھی، مگر نظر یوں آتا تھا جیسے ابھی ابھی اس کا تابوت یہاں لاکر رکھا گیا ہو۔

دفعتہً شیخ صوما کے منہ سے ایک تحیر آمیز چیخ نکلی اور اس نے سختی سے میرا بازو پکڑ لیا اور گھٹی ہوئی آواز میں بولا: "وہ کیا ہے؟" شیخ کی انگلی لاش کے سینے کی طرف جھکی ہوئی تھی۔ دہشت سے میرا رواں رواں کانپ اٹھا۔ لاش کے سینے پر نہایت سبک اور سنگِ مرمر کی مانند سفید انسانی ہاتھ رکھا تھا۔ پہنچے پر سے کٹا ہوا ایک ہاتھ ——— جو یقیناً اسی عورت کا تھا، لیکن جس انکشاف نے میرے دل پر لرزہ طاری کیا، وہ اس کٹے ہوئے ہاتھ کی سات لمبی اور بے حد نازک انگلیاں تھیں جن کے سروں پر خاصے لمبے لمبے اور نوکیلے ناخن بڑھے ہوئے تھے۔

ہم سب دم بخود پتھر کے بتوں کی مانند اپنی اپنی جگہ کھڑے تھے۔ پھر میں نے آہستہ سے اس کٹے ہوئے ہاتھ کو چھوا اور فوراً ہی تڑپ کر ہاتھ کھینچ لیا۔ خدا گواہ ہے کہ ہاتھ لگاتے ہی یوں محسوس ہوا جیسے میں نے گوشت پوست کے کسی زندہ اور متحرک جسم کو چھو لیا ہو۔ یہ کٹا ہوا ہاتھ کیا واقعی زندہ تھا یا صرف میرا وہم؟ — چند لمحے بعد میں نے ہمت کر کے اس ہاتھ کو دوبارہ چھوا، تو پھر اسی حرکت اور گرمی کا احساس ہوا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خون ابھی تک سات انگلیوں والے ہاتھ کی رگوں میں گردش کرتا ہے۔ میں نے اس مرتبہ ہاتھ کو لاش کے سینے پر سے اٹھانے کی کوشش کی تھی اور اسی لمحے اس کے نیچے ایک شعلہ سا لپکا۔ ہاتھ کے عین نیچے خونِ کبوتر کی مانند سرخ رنگ کا ایک بڑا اور انتہائی بیش قیمت یاقوت پڑا جگ مگ جگ مگ کر رہا تھا۔

اُس وقت شیخ صوما میرے برابر کھڑا تھا اور بقیہ تینوں آدمی دوسرے تابوت کو کھولنے کی کوششوں میں لگ گئے تھے، کیونکہ بڑے تابوت میں لاش کے سوا کچھ اور نہ تھا۔ میں نے چشم زدن میں اس یاقوت کو اٹھا لیا اور غور سے دیکھنے لگا۔ بخدا ایسا لاجواب اور بے مثال یاقوت میں نے اپنی زندگی میں اس سے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ یاقوت زیادہ بڑا نہیں ہوتا، لیکن یہ یاقوت اپنی جسامت کے باعث نادرِ روزگار یاقوت تھا۔ اس پر کسی فن کار نقاش نے نہایت حسین اور دیدہ زیب سات ستارے نقش کیے تھے اور ان ستاروں سے روشنی کی کرنیں مسلسل پھوٹ رہی تھیں۔

جونہی یاقوت میرے ہاتھ میں آیا، میں نے اپنے قلب و دماغ میں ایک حیرت انگیز تبدیلی محسوس کی۔ کوئی غیبی آواز بار بار میرے کان میں کہہ رہی تھی کہ اب اس مقبرے سے نکل جانا چاہیے؛ چنانچہ میں نے شیخ صوما کو واپس چلنے کا اشارہ کیا۔ دراصل مجھے خدشہ یہ تھا کہ میں اس وقت ایک سنسان اور ویران مقبرے میں، جو زمین کی سطح سے تین سو فٹ بلند ہے، چار اجنبی عرب بدوؤں میں گھر گیا ہوں۔

ان کا سر، ستاروں والا یاقوت اُٹھاتے ہوئے دیکھ چکا ہے۔ کیا اِن کی نیت بد نہیں ہو سکتی؟ اگر یہ لوگ مجھے یہیں ہلاک کر دیں، تو میری تلاش میں آنا تو درکنار، کسی کو پتہ بھی نہ چل سکے گا کہ فان ہیون نامی سیاح ہالینڈ کا رہنے والا، مصر کے ایک نامعلوم صحرا میں سیاحت کے لیے گیا اور واپس نہیں آیا۔ یہ پریشان کُن خیال میرے ذہن میں بجلی کی تیزی سے آیا اور میں نے مقبرے سے نکل بھاگنے کا ارادہ کر لیا؛ تاہم اسی وقت یہ بھی طے کر لیا تھا کہ موقع پا کر تنِ تنہا یہاں آؤں گا اور اطمینان سے پورے مقبرے کی تلاشی لوں گا۔ اس بیش قیمت یاقوت کے علاوہ تابوت کے اندر جو جواہرات پیوست ہیں، انہیں بھی نکال لوں گا جنہیں یہ عرب بدّو حیرت و حسرت کی ملی جُلی نظروں سے دیکھتے تھے، لیکن بار بار ہتھوڑے چلانے کے باوجود کوئی قیمتی پتّھر اُن کے ہاتھ نہ آتا تھا۔

اتنے میں بدّوؤں نے دوسرا تابوت کھول لیا، لیکن اس میں بھی ہیرے جواہرات نہ تھے۔ ہاں، چار حنُوط شدہ کھوپڑیاں ضرور رکھّی تھیں۔ ایک کھوپڑی انسان کی، دوسری کُتّے کی، تیسری گیدڑ کی اور چوتھی ایک عقاب کی۔ اِن سب پر بھی مصری رسم الخط میں عبارتیں اور ہندسے نقش تھے، لیکن اِتنا مجھے معلوم تھا کہ قدیم مصری جب اپنے بادشاہوں اور شہزادوں کی لاشیں حنُوط کرتے تھے، تو اُن کی انتڑیاں اور بھیجا وغیرہ نکال کر جانوروں کی اسی کھوپڑیوں میں محفوظ کر دیتے تھے، ممکن ہے اس شہزادی یا ملکہ کی انتڑیاں اور بھیجا اِن میں بند ہو، مگر دیکھتے ہی دیکھتے ایک بدّو نے انسانی کھوپڑی اُٹھائی اور زمین پر دے ماری۔ سیاہ رنگ کا لیس دار اور گاڑھا روغن اس میں سے برآمد ہُوا اور فرش پر پھیل گیا۔ اس روغن میں بدبو کے بجائے عجیب مدہوش کُن خوشبو تھی۔ ایک سحر انگیز اور فرحت بخش خوشبُو، اور قریب تھا کہ ہم سب اس کے زیرِ اثر غش کھا کر گر پڑیں کہ شیخ صوُما نے اپنے ساتھیوں کو فوراً باہر نکلنے کا حکم دیا اور پھر ہم سب وہاں سے گرتے پڑتے بھاگ اُٹھے۔ باہر آ کر جب ریگستان کی گرم اور صاف ہوا میں سانس لیا، تو جان میں جان آئی۔ ایک بار پھر اسی مشقّت اور

اعصاب شکن کوشش کے ساتھ پتھّر کی سِل مقبرے کے دروازے پر سرکائی، لیکن میں نے ہوشیاری سے اتنی گنجائش ضرور رکھّی کہ بوقتِ ضرورت اِس میں داخل ہو سکوں۔

اَب میں اپنے عرب ساتھیوں کے برعکس جلد از جلد اِس منحوس مقام سے رخصت ہو جانا چاہتا تھا، کیونکہ اُن کا شیخ بار بار للچائی نظروں سے میری اس مُٹھّی کی طرف تکتا جس میں سات ستاروں والا یاقوت دبا ہوا تھا، دراصل وہ مجھ سے اس بارے میں کچھ کہنا چاہتا تھا، لیکن اِس ڈر سے کہ اس کے ساتھی بھی حصّہ لینے پر تکرار نہ کریں، خاموش تھا۔

چٹان پر چڑھنا اِس قدر مشکل نہ تھا جتنا نیچے اُترنا۔ آگے آگے تین عرب تھے، ان کے پیچھے شیخ صوُما۔ ابھی ہم چٹان کے بالکل درمیان ہی میں تھے کہ ایک بدّو کا پیر پھسلا اور ایک ہولناک چیخ کے ساتھ ڈیڑھ سو فٹ نیچے زمین کے قریب ایک دوسری سنگین چٹان پر گرا اور گرتے ہی مَر گیا۔ اِس حادثے کا کیا اثر دل پر ہوا، بیان سے باہر ہے۔ بعد میں مرنے والے کے دو ساتھیوں نے بتایا کہ ہمیں کچھ یوں احساس ہُوا جیسے اُسے کسی اَن دیکھے ہاتھ نے دھکّا دیا تھا —— مرنے والا بدّو وہی تھا جس نے تابوت میں سے کاسۂ سر نکال کر فرش پر دے مارا تھا اور اب .... اُف خدایا .... خود اس کا سر چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو چکا تھا اور بھیجے کے ریزے خون میں لتھڑے اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے تھے۔

شیخ صوُما بھی اِس حادثے پر بے حد خوفزدہ نظر آیا؛ تاہم اُس نے اپنے ساتھیوں کو ہدایت کی کہ مرنے والے کی لاش اُٹھا کر کچھ دُور لے جائیں اور ریت میں دبا دیں۔ یہ کہہ کر اُس نے مجھے اُونٹ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ خود اپنے اُونٹ پر سوار ہُوا اور ہم پڑاؤ کی طرف چل پڑے۔ میرا خیال تھا کہ شیخ اس موقعے سے فائدہ اٹھا کر یاقوت کے بارے میں کچھ کہے گا، لیکن خلافِ توقع وہ خاموش رہا اور اُس کی یہی خاموشی میری پریشانی کا سبب بن رہی تھی؛ تاہم میں ہر حادثے اور ہر حملے کے لیے بالکل تیّار و مستعد تھا۔

ہم خاصی دیر تک سفر کرتے رہے، پڑاؤ ابھی بہت دُور تھا اور سُورج دیکھتے ہی دیکھتے ہمارے سروں پر سے گزر کر مغرب کی آغوش میں پناہ لینے کے لیے دوڑا جا رہا تھا۔ ہر طرف پُرہول سناٹا طاری تھا اور دُور جنوب کی طرف آسمان پر چند گدھ منڈلا رہے تھے۔ شیخ صُوما کے ساتھی ابھی تک واپس نہیں آئے تھے، چنانچہ اُن کے انتظار میں ہمیں ایک جگہ رُکنا پڑا۔

وقت گزرتا گیا۔ سُورج کبھی کا غروب ہو چکا تھا۔ آسمان پر تارے جھلملانے لگے، لیکن شیخ صُوما کے دونوں آدمی واپس نہ آئے۔ اب وہ بے چینی سے ٹہل رہا تھا اور میری طرف شعلہ بار نگاہوں سے گھورتا جاتا تھا۔ گویا اس تمام نقصان اور تباہی کا ذمے دار میں ہوں۔ اِدھر میں بھی اپنے لبادے کے اندر لمبا خنجر چھپائے منتظر تھا کہ کب وہ مجھ پر حملہ کرتا ہے۔ آخر دُور سے اُونٹوں کے دوڑنے کی آواز ہمارے کانوں میں آئی اور پھر تاریکی کا سینہ چیرتے ہوئے دو اُونٹ ہماری جانب آتے دکھائی دیے، لیکن.... دوسرے اُونٹ کا سوار کہاں تھا؟

شیخ صُوما کے دو آدمیوں میں سے صرف ایک ہی شخص واپس آیا تھا۔ اُس نے جلدی سے اونٹ بٹھایا اور چھلانگ لگا کر نیچے اُترا۔ اُس کا سانس بے طرح پھُولا ہُوا تھا —— انتہائی اضطراب اور دہشت کے عالم میں اُس نے عربی میں شیخ صُوما سے جلد جلد کچھ کہا جس کا مفہوم میرے پلّے یہ پڑا کہ دوسرے شخص کو کوئی پہاڑی شیر اُٹھا کر لے گیا ہے۔ یہ سُن کر میرا دل کانپ اُٹھا اور مقبرے کی سُرنگ میں بنے ہُوئے شیر کی تصویر بار بار میری آنکھوں کے سامنے گھومنے لگی۔ مَیں نے شیخ سے کہا کہ یہاں ٹھہرنا فضول ہے، پڑاؤ کی طرف چلنا چاہیے، لیکن اُس نے خونیں نظروں سے میری جانب دیکھ کر نفی میں گردن ہلائی اور کرخت لہجے میں بولا:

”مَیں اُس وقت تک پڑاؤ میں نہ جاؤں گا، جب تک اُس شیر کو تلاش کر کے ہلاک نہ کر دوں اور تمہیں بھی میرے ساتھ رہنا پڑے گا۔ کیا مَیں نے تمہارا ساتھ

مَیں خون کے گھونٹ پی کر خاموش ہو گیا، لیکن شیخ اور اس کے ساتھی کا رنج دُور کرنے کے لیے مَیں نے جیب سے سونے کے چند سکّے نکالے اور اُن کی طرف بڑھا دیے: ”مجھے افسوس ہے شیخ کہ تمہارے دو آدمی میری وجہ سے اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے۔“ مَیں نے معذرت آمیز لہجے میں کہا۔

”جو پیدا ہوا، اسے بہرحال ایک نہ ایک روز مرنا ہے۔ مَوت کا وقت ٹل نہیں سکتا۔ یہ رقم تم ان آدمیوں کے لواحقین کے حوالے کر دینا۔“

سونے کے سکّے دیکھ کر شیخ صُوما اور اس کے ساتھی کی آنکھیں مسرّت سے چمک اُٹھیں اور چہرے پر پھیلے ہوئے ناگوار اثرات کسی قدر زائل ہو گئے۔ مَیں دیر تک اسی طرح کی چکنی چپڑی باتیں کرتا رہا، تاہم دل میں ڈرتا بھی تھا کہ ان وحشی بدوؤں کا کیا اعتبار۔ آدھی رات تک ہم جاگتے اور باتیں کرتے رہے۔ پھر شیخ صُوما اور اُس کا ساتھی ایک طرف ہٹ کر لیٹ گئے۔ مَیں بھی کچھ فاصلے پر ایک ٹیلے کے ساتھ پُشت لگا کر بیٹھ گیا اور دل میں طے کر لیا کہ خواہ کچھ ہو، مَیں ایک ثانیے کے لیے بھی پلک نہ جھپکاؤں گا۔

شیخ اپنے ساتھی سے چپکے چپکے نہ جانے کیا کہہ رہا تھا جسے مَیں صحیح طور پر نہ سمجھ سکا۔ یکایک اس گھُپ اندھیرے میں سفید سفید کوئی چیز چمکی اور مَیں نے دیکھا یہ وہی سات انگلیوں والا ہاتھ ہے جو عرب بدو اپنے سردار شیخ صُوما کو دکھا رہا تھا۔ مَیں اُن کی گفتگو سُننے کے لیے کھسک کر آگے ہُوا۔ وہ شیخ سے کہہ رہا تھا:

”یہ ہاتھ کتنا خوبصورت ہے.... مَیں اسے کسی امیر کے ہاتھ فروخت کر دوں گا۔“

”تم اسے کیوں اُٹھا لائے بدبخت۔“ شیخ نے دبی زبان سے غصّے کا اظہار کیا۔

”یا شیخ، مَیں اسے اُٹھا کر نہیں لایا، بلکہ وہ لایا تھا جس کا پیر چٹان پر سے پھسل گیا تھا اور جسے ہم دفنانے گئے تھے۔ یہ ہاتھ اُسی کے لبادے میں چھپا ہُوا تھا۔

یقیناً وہی اسے مقبرے میں سے اٹھا کر لایا ہوگا۔"

یہ سُن کر میرا کلیجہ بیٹھنے لگا اور طرح طرح کے صدہا خدشات ذہن میں سر اُٹھانے لگے۔ مجھے یاد آیا کہ کٹا ہوا یہی ہاتھ اس ستاروں والے یاقوت کی حفاظت کر رہا تھا۔ کیا اس میں کوئی طلسم پوشیدہ ہے؟ اس یاقوت کی کیا اہمیت ہے ..... یہ ہاتھ کس لیے کاٹا گیا ..... وہ لاش کس عورت کی تھی ..... وہ ضرور کوئی عالی وقار ملکہ یا شہزادی تھی ..... کاش میں اس کے تابوت پر لکھی ہوئی عبارتیں پڑھ سکتا۔

میں انہی تصوّرات و خیالات میں گُم تھا کہ شیخ اور اُس کے ساتھی کے خراٹوں کی دماغ پاش آوازیں اُٹھنے لگیں۔ وہ تو سو چکے، اب مجھے کیا کرنا چاہیے کیا بھاگ نکلوں، لیکن ایسا کرنا حماقت ہوگی۔ میں بھاگ کر جاؤں گا کہاں؟ یہ لوگ مجھے جیتا نہ چھوڑیں گے۔ میں نے اپنے آپ کو تقدیر کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ رات چیونٹی کی طرح رینگ رہی تھی۔ فضا میں نمی بڑھتی جا رہی تھی، حتیٰ کہ میں سردی سے کانپنے لگا اور پھر اسی عالم میں میرے پپوٹے بھاری ہونے لگے۔ میں نے جاگنے کی بہتیری کوشش کی، مگر بے سُود۔ آنکھیں خود بخود بند ہوئی جاتی تھیں۔ مجھے خیال آیا کہ اگر میں سو گیا اور اس دوران میں شیخ صوُما نے بیدار ہو کر یاقوت چرانا چاہا تو مجھے قطعاً پتہ نہ چلے گا۔ یاقوت کو کہاں چھپاؤں ..... کوئی تدبیر ذہن میں نہ آئی۔ مجبوراً میں نے اُسے دائیں ہاتھ کی مٹھی میں سختی سے بھینچا اور یہ ہاتھ اپنی بغل میں دبا کر دُنیا و مافیہا سے بے خبر سو گیا۔

آنکھ کھُلی تو سورج آسمان پر پُوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ میں نے آنکھیں مَل کر گرد و پیش کا جائزہ لیا اور پھر جیسے رگوں میں دوڑتا ہوا خون جمنے لگا۔ میری پشت کی جانب شیخ صوُما کی لاش چت پڑی تھی۔ اُس کا ساتھی چاروں اونٹوں سمیت نہ جانے کہاں غائب ہو گیا تھا۔ سب سے پہلا خیال میرے دماغ

میں یہی آیا کہ شیخ کے ساتھی ہی نے اسے ہلاک کر دیا ہے، لیکن غور سے دیکھا تو معاملہ کچھ اور تھا۔ شیخ صوُما کی آنکھیں اُبلی ہوئی تھیں اور چہرہ بالکل سیاہ پڑ چکا تھا۔ اُس کا منہ بھیانک انداز میں کھُلا ہُوا تھا اور زبان نصف سے زیادہ باہر نکل آئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُس نے انتہائی اذیّت کے عالم میں جان دی ہے۔ پھر میں نے اس کے گلے پر انگلیوں کے گہرے نشان دیکھے۔ یہ نشان سرخ رنگ کے تھے اور ان کی تعداد سات تھی۔

اس انکشاف سے میری جو کیفیت ہوئی، اسے کس طرح بیان کروں۔ دماغ نے کام کرنا چھوڑ دیا اور میں وہیں بیٹھے بیٹھے بُری طرح کانپنے اور لرزنے لگا۔ چند لمحے تک میری یہی حالت رہی، پھر غیر شعوری طور پر میں دوبارہ شیخ صوُما کی لاش پر جھُکا اور سُرخ نشانوں کو غور سے دیکھنے لگا۔ بلاشبہ یہ اُسی کٹے ہوئے ہاتھ کا کارنامہ تھا ..... لیکن ..... کیا کٹے ہوئے ہاتھ کسی زندہ اور طاقتور انسان کا گلا گھونٹ سکتے ہیں؟ معاً ایک عجیب تماشا ہُوا۔ میری مٹھی میں دبا ہُوا یاقوت نکل کر شیخ صوُما کے مُنہ پر گرا اور فوراً ہی لاش کے مُنہ سے گاڑھے گاڑھے سُرخ خون کے لوتھڑے نکلنے لگے اور آناً فاناً اس کے جسم اور کپڑے خون میں لت پت ہو گئے۔ میں دیوانہ وار اپنے یاقوت کی تلاش میں لاش کو اُلٹنے پلٹنے لگا، کیونکہ یاقوت بھی خون کے ان لوتھڑوں کے ساتھ ہی صوُما کے کپڑوں میں کہیں چھُپ گیا تھا۔ جونہی میں نے لاش کو پیٹ کے بل اُٹھایا، لاش کا دایاں ہاتھ، جو پہلے پُشت کے نیچے دَبا ہُوا تھا، میرے سامنے آ گیا۔ اس ہاتھ میں ایک لمبا ہلال نما تیز خنجر تھا جس کے دستے پر شیخ صوُما کی انگلیاں اس سختی سے پیوست تھیں کہ کوشش کے باوجود اس کے ہاتھ سے یہ خنجر چھُڑا نہیں سکا۔ کچھ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آدھی رات کے بعد کسی وقت جب کہ میں نیند میں بُری طرح ڈوبا ہوا تھا، شیخ صوُما مجھے قتل کرنے کے ارادے سے اُٹھا اور یہ خنجر لے کر میری طرف بڑھا مگر اس کی یہ ناپاک خواہش پُوری نہ ہوئی اور غیب سے خود اُسی کی ہلاکت کا سامان ہو گیا۔

صوما کی لاش کو اُلٹتے پلٹتے میں خود بھی خون سے اپنے کپڑے نہ بچا سکا۔ لیکن بہرحال یاقوت میں نے دوبارہ پا لیا۔ میں وہاں سے وحشیوں اور دیوانوں کی طرح بھاگا اور صحرا میں بھوکا پیاسا دو دن اور دو راتیں بھٹکنے کے بعد ایک دوسرے عرب قبیلے میں جا پہنچا۔ ان لوگوں نے مجھے نئے کپڑے دیے اور ہر طرح میری خبرگیری کی پھر میں وہاں سے اپنے وطن ہالینڈ چلا آیا۔ دوبارہ مقبرے کی طرف جانے کی جرأت تھی نہ خواہش۔ اس کے بعد سالہا سال گزر گئے، مجھے نہ اس ممی کے بارے میں کچھ پتہ چلا اور نہ اُس کے کٹے ہوئے ہاتھ کا کوئی سُراغ ملا کہ وہ کہاں گیا اور کس کے ہتھے چڑھا۔ سات ستاروں والا یاقوت ابھی تک میرے پاس ہے ــــ میں جب اُسے ہاتھ میں لیتا ہوں، تو ایک عجیب سے سُرور کا احساس ہوتا ہے اور دل قوی ہونے لگتا ہے۔ اُس کے ستاروں میں سے اب بھی روشنی کی کرنیں مسلسل پھوٹتی ہیں ... لیکن اس پر لکھی ہوئی انتہائی باریک عبارتیں نہیں پڑھ سکا ...."

اس سے آگے یک لخت فان ہیون کی حیرت انگیز رُوداد ختم ہو جاتی ہے۔

ساحر کی وادی

میں ابھی ناشتے سے فارغ ہُوا ہی تھا کہ دروازہ آہستہ سے کھُلا اور پروفیسر کاربیک اندر آیا۔

"میں تمہارے کام میں مُخل تو نہیں ہُوا؟" اس نے معذرت آمیز لہجے میں پوچھا۔

"مُطلق نہیں ــــ بلکہ میں خود تھوڑی دیر بعد آپ کی خدمت میں حاضر ہونے والا تھا۔" میں نے جواب دیا۔ کاربیک آرام کرسی پر اطمینان سے بیٹھ گیا اور کہنے لگا:

"میرا خیال ہے تم نے فان ہیون کے سفرنامے سے خوب لطف اُٹھایا ہو گا۔"

"بے شک ۔ نہایت دلچسپ اور بے مثال سفرنامہ ہے، اور اگر یہ سارا تماشا میں اپنی آنکھ سے نہ دیکھتا تو حشر تک مجھے یقین نہ آتا کہ یہ سفرنامہ ہوش و حواس کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ میں اسے کسی مجذوب کی بڑ تسلیم کرتا، مگر اب حیران ہوں کہ آپ حضرات کو ان سب باتوں کا علم کیسے اور کیوں کر ہُوا۔"

کاربیک نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور اس کی آنکھیں کسی فاتحانہ خوشی کے زیرِ اثر چمکنے لگیں۔

"آہ، میرے عزیز، تم غالباً یہ پُوچھنا چاہتے ہو کہ فان ہیون کی اس خطرناک مہم کا علم ہم لوگوں کو کیسے ہوا۔ یہ داستان حد درجہ دلچسپ بھی ہے اور حیرت انگیز

بھی ـــــ چونکہ اس میں کئی باتیں کام کی آئیں گی، اس لیے دھیان دے کر سُننا۔ ذرا اپنی کُرسی میرے قریب لے آؤ۔"

میں نے اثبات میں گردن ہلائی اور اپنی کُرسی پروفیسر کے اور قریب گھسیٹ لی۔ چند لمحے سوچنے کے بعد کاربیک نے اپنی کہانی کا آغاز یُوں کیا:

"فان ہیون کو اس دنیا سے رخصت ہوئے دو صدیاں گزر چکی ہیں۔ ہالینڈ پہنچنے کے بعد اِس شخص کا کیا حشر ہوا اور جو یاقوت اُس نے حاصل کیا تھا، وہ مسٹر ٹریلانی کے ہاتھوں میں کیسے آیا، یہ ایک عبرت ناک داستان ہے جو میرے اور مسٹر ٹریلانی کے سوا دنیا میں کسی اور کو معلوم نہیں۔ اب میں یہ راز پہلی مرتبہ تمہارے حوالے کرتا ہوں۔

"کئی برس پہلے کا ذکر ہے۔ میں اور مسٹر ٹریلانی ہالینڈ میں تھے اور لائیڈن یونیورسٹی کے شعبۂ علومِ مشرقی میں داخل ہو کر قدیم کتابوں اور دوسرے نوادر کی جانچ پڑتال اور مطالعے میں ہمہ تن مصروف تھے۔ اس یونیورسٹی میں ولندیزی زبان کی قلمی کتابوں کا ایک انبار لگا ہے اور اگرچہ مسٹر ٹریلانی بہت سی مشرقی اور مغربی زبانیں جانتے ہیں، لیکن ایک روز وہ ایسی بوسیدہ کتاب لے کر نہایت پریشانی کے عالم میں میرے پاس آئے جس کا رسم الخط اور طرزِ بیان اُن کے لیے قطعی غیر مانوس تھا، مگر میں اس پر سرسری نظر ڈالتے ہی سمجھ گیا کہ یہ وہ خُفیہ زبان ہے جو ہالینڈ کے شمالی حصّے میں تقریباً کئی سو برس پیشتر ایک خاص طبقے کے لوگوں میں رائج تھی، اور اب اس کے جاننے اور پڑھنے والے دُنیا میں بہت کم لوگ باقی ہیں۔ میں نے مسٹر ٹریلانی سے یہ کتاب لے لی اور اسے پڑھنے کی کوشش کی۔ بہت جلد پتہ چل گیا کہ یہ ولندیزی سیاح نکولس فان ہیون کا "سفرنامہ سرزمینِ نیل" ہے۔ چونکہ یہ کتاب میری اور مسٹر ٹریلانی کی مشترکہ دل چسپیوں کا باعث تھی، اس لیے میں فوراً لائبریرین کے پاس پہنچا اور اس کتاب کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرنا چاہیں۔ اُس نے اپنے کیٹلاگ کو کھنگالا اور تھوڑی دیر بعد یہ خوش خبری سُنائی کہ اس سفرنامے کا ہالینڈ کی اصل زبان میں ترجمہ ہو چکا ہے اور اس کا ایک اور نسخہ بھی لائبریری

میں موجود ہے؛ چنانچہ یہ نسخہ بھی دیکھا گیا۔ اس کے بعد ۱۶۵۰ء کا مطبوعہ انگریزی نسخہ بھی ہمارے ہاتھ لگا جو ولندیزی سے ترجمہ کیا گیا تھا اور ایمسٹرڈم میں چھپا تھا۔ یہ وہی نسخہ ہے جو تم نے پڑھا۔ فان ہیون نے اپنے قیامِ مصر کے مشاہدات تفصیل سے لکھے تھے، لیکن اُس نے اسوان کے مشرقی حصّے میں ساحر کی جن "وادی" اور تین سو فٹ اونچے ہَرَم کا ذکر کیا تھا، وہ ہمارے لیے بالکل نئی چیز تھی۔ مسٹر ٹریلانی کا خیال تھا کہ ولندیزی سیاح نے یہ سب کچھ بکواس کی ہے اور ایسے ہَرَم کا کوئی وجود نہیں؛ تاہم یہ بات انھوں نے بھی تسلیم کی کہ یہ شخص فان ہیون مصر گیا ضرور تھا۔ کیونکہ اس کے سفرنامے میں کٹے ہوئے ہاتھ، سات ستاروں والے یاقوت اور ممّی کے ذکر کے سوا جن کی تصدیق کا کوئی ذریعہ ہمارے پاس نہ تھا، بقیہ سب باتیں حرف بہ حرف درست تھیں۔

وہیں طے پایا کہ میں اس شخص یعنی فان ہیون کے شہر جاؤں اور معلوم کرنے کی کوشش کروں کہ آیا اس کے خاندان کے کچھ لوگ ابھی زندہ سلامت ہیں یا سب مر کھپ گئے۔ ممکن ہے کچھ نئی باتیں معلوم ہو سکیں۔ خصوصاً، ہم دونوں اس یاقوت کے بارے میں یہ جاننے کے لیے بے چین تھے کہ فان ہیون نے اس کا کیا کیا اور اب وہ یاقوت کہاں اور کس کے پاس ہے۔ اگر وہ یاقوت دستیاب ہو جاتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ فان ہیون کی لکھی ہوئی داستان میں کوئی مبالغہ نہیں۔

"ہورن ـــــ ہالینڈ کا نہایت قدیم شہر ہے اور فان ہیون اسی شہر کا رہنے والا تھا۔ گذشتہ دو سو برس سے اس شہر میں کوئی خاص تبدیلی واقع نہ ہوئی تھی۔ فان ہیون کا مکان تلاش کرنے میں مجھے کوئی دِقت نہ ہوئی، کیونکہ اس ولندیزی سیّاح کی پُراسرار شخصیت کے بارے میں اب بھی ہورن کے لوگوں میں طرح طرح کی کہانیاں مشہور تھیں۔ یہ ایک نہایت بوسیدہ اور اُجاڑ دو منزلہ مکان تھا جس کے دَر و دیوار پر حسرت برس رہی تھی۔ باغ ویران تھا۔ ہر طرف خودرو گھاس اور جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں اور درخت ٹُنڈ منڈ تھے جیسے اُن پر خزاں کا مستقل اثر ہو۔

"مکان کا دروازہ کھلا تھا، میں نے دستک دی۔ چند لمحے بعد ایک پیرِ فرتوت، جسے دکھائی نہ دیتا تھا، لڑکھڑاتا ہُوا آیا اور میرے سامنے آن کر رُکا۔ میرا خیال تھا یہ شخص شاید فان ہیون کا پڑپوتا یا سگڑپوتا ہوگا، لیکن جونہی میں نے فان ہیون کا ذکر چھیڑا، بُڈھا برافروختہ ہوگیا:

"میں کسی فان ہیُون کو نہیں جانتا ——— بھاگ جاؤ یہاں سے ——— اُس کی نسل ختم ہوچکی ہے۔ سب مَرکھپ گئے۔"

"لیکن اُس کا سامان . . . اور کتابیں وغیرہ تو ہوں گی جو وہ مصر سے لایا تھا؟"

مَیں نے چلّا کر پوچھا، کیونکہ بڑے میاں خیر سے بہرے بھی تھے۔

"کوئی سامان وامان نہیں ہے ——— سب بیچ دیا کباڑیوں کے ہاتھ۔ جاؤ، وہیں تلاش کرو۔"

"یہ کہہ کر اُس بڈھے نے دروازہ بند کردیا۔ مزید تحقیق کی تو پتہ چلا کہ واقعی بڈھا سچ کہتا تھا۔ فان ہیُون کے خاندان کا کوئی فرد دنیا میں موجود نہ تھا۔ سب لوگ یکے بعد دیگرے حادثوں کا شکار ہوکر رُخصت ہوچکے تھے ——— پھر میں نے نوادر اور قدیم اشیاء فروخت کرنے والے کباڑیوں اور تاجروں سے رابطہ قائم کیا۔ یہ لوگ مجھے جانتے تھے، لیکن کسی کو معلوم نہ تھا کہ فان ہیُون کا سامان کہاں گیا اور کس کے پاس فروخت ہُوا تھا۔ ایمسٹرڈم، لائیڈن اور زیورچ کے عجائب خانوں کا ایک ایک گوشہ مَیں نے دیکھا، مگر وہاں فان ہیون کی کوئی چیز موجود نہ تھی——— میری مایوسی کی انتہا نہ رہی۔

"ایک روز میں اپنی گھڑی ٹھیک کرانے ہُورسن ہی کے ایک گھڑی ساز کے پاس پہنچا۔ چھوٹی سی دُکان تھی اور آدمی خاصا عمر رسیدہ اور تجربے کار نظر آتا تھا۔ باتوں باتوں میں معلوم ہُوا کہ وہ جواہرات کی خرید و فروخت کا دھندا بھی کرتا ہے۔ مَیں نے یُونہی بے پروائی سے پوچھا:

"کیا آپ کے پاس اِس وقت کوئی عُمدہ پتّھر ہے؟"

"ہے تو سہی، لیکن اسے آپ پسند نہ کریں گے، کیونکہ اس پر کچھ کھُدا ہوا ہے۔"

یہ سُن کر میرے کان کھڑے ہوئے۔ مَیں نے کہا:

"کیا مَیں وہ پتّھر دیکھ سکتا ہوں؟"

"کیوں نہیں جناب، ضرور دیکھیے۔"

اُس نے اپنی آہنی تجوری کھولی، ایک چھوٹا سا لکڑی کا ڈبّا نکالا اور میرے سامنے رکھ دیا۔ میں نے اپنے اضطراب پر قابو پاتے ہوئے ڈبّا کھولا۔ زرد رنگ کی مخمل کے اندر جگ مگ جگ مگ کرتا سات ستاروں والا یاقُوت رکھا تھا۔ ایک لحظے کے لیے میری آنکھوں کی روشنی جیسے غائب ہوگئی۔ خوشی، بے پناہ اضطراب، خوف اور حیرت کا وہ لمحہ مجھ پر زَن سے گزر گیا، لیکن میرے ہوش و حواس لیتا لیتا گیا۔ مَیں دیر تک آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اُس نادر یاقوت کو دیکھتا رہا۔ پھر مَیں نے بوڑھے دُکان دار سے اس کی قیمت دریافت کی۔

"ارے صاحب، جو آپ کا جی چاہے، دے دیجئے۔ آپ خود قدر دان ہیں۔" دکان دار نے سادہ لوحی سے کہا۔ غالباً وہ خود بھی اِس "ناکارہ کھُدے ہوئے پتّھر" کی حفاظت کرتے کرتے اکتا چکا تھا اور جلد سے جلد اس سے پیچھا چھڑانے کا خواہش مند تھا۔ مَیں اگر چاہتا تو اس یاقوت کو، جس کی قدر و قیمت کے سامنے واقعی دُنیا بھر کے خزانے ہیچ تھے، نہایت اَونے پونے خرید سکتا تھا، مگر میرے ضمیر نے گوارا نہ کیا کہ سادہ لوح دکاندار کو دھوکا دوں۔ اس کے اِس جملے پر میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ سمجھا کہ شاید گاہک ہاتھ سے گیا، فوراً کہنے لگا:

"چلیے آپ ایک سو پونڈ دے دیجئے۔ اس سے زیادہ رعایت ممکن نہیں۔"

مَیں نے یاقوت کو مخمل میں لپیٹا، ڈبّے میں بند کیا، ڈبّا اپنے بیگ میں رکھا اور کرنسی نوٹوں سے بھرا ہوا بٹوا گھڑی ساز کے ہاتھ میں تھما کر دکان سے باہر نکل گیا۔ مَیں اس نایاب پتّھر کو پاکر اب جلد سے جلد ہالینڈ سے نکل جانا چاہتا تھا۔ مَیں نے

گھڑی ساز سے اس کی رسید تک لینے کی زحمت نہ کی۔ میرے بٹوے میں ایک ہزار پونڈ تھے اور یقیناً وہ بوڑھا اب تک مجھے فاترالعقل یا دیوانہ سمجھ رہا ہوگا۔

"قصّہ مختصر مَیں لندن پہنچا۔ مسٹر ٹریلانی میرا انتظار کر رہے تھے۔ آہ — وہ لمحہ جب مَیں نے اچانک اپنی جیب سے یاقوت نکال کر مسٹر ٹریلانی کے آگے رکھا تھا، شاید مرتے دم تک بھول نہ سکوں گا۔ یاقوت کو دیکھ کر ان کا چہرہ یک لخت ویسا ہی سُرخ ہوگیا جیسا یاقوت اور آنکھیں تارا بن گئیں۔ وہ ٹکٹکی باندھے دیر تک اس عجیب پتھر کو گھورتے رہے، پھر اُٹھے اور مجھ سے بغل گیر ہو گئے۔ انھوں نے صِرف ایک جُملہ کہا:

"میرے دوست، اب مجھے فان ہیُون کے سفرنامے کا ایک ایک حرف کا پُورا یقین ہے کہ اُس نے سچ لکھا ہے۔ ہم چند روز تک خود اس وادی کی تلاش میں نکلیں گے جہاں سے اس ولندیزی سیاح نے یہ یاقوت پایا تھا۔"

"اس میں کوئی شک نہیں میرے عزیز مالکم رُوز، کہ مسٹر ٹریلانی کی بے انتہا دولت اور اُن کی جگرداری ہر جگہ کام آئی ہے اور اِس نوعیت کی خطرناک مہموں میں، جنھیں سَر کرنا ایک معجزے سے کم نہیں ہوتا، یہ دونوں خوبیاں مہم جُو میں ہونا لازمی ہیں۔

"بہرحال مسٹر ٹریلانی سفر کی تیاریوں میں ہمہ تن مصروف ہوگئے۔ اَب اُن کے دِل میں فان ہیون کے سفرنامے کے بارے میں ذرہ برابر شک و شبہ نہ تھا۔

"اُن دِنوں مصر کے اندر خاصی گڑبڑ پھیلی ہوئی تھی اور کچھ سیاسی نوعیت کے ہنگامے برپا تھے۔ اعرابی پاشا کی حکومت غیرملکیوں، خصوصاً انگریزوں کا مصر میں آنا جانا زیادہ پسند نہ کرتی تھی، لیکن اس موقع پر بھی مسٹر ٹریلانی کی دولت اور علم و فضل کام آیا۔ انھوں نے مصری حکومت سے اُسوان کے مشرقی حصّے کی سیاحت کے لیے خصوصی اجازت نامہ حاصل کر لیا۔ یُوں بھی وہاں ہر چھوٹا بڑا سرکاری افسر ہم دونوں کو اچھی طرح جانتا پہچانتا تھا کہ ہم لوگ اُن کے ملک میں کسی بُری نیّت سے نہیں آتے،

بلکہ قدیم کھنڈروں کو کھودنے، لاشیں اُکھاڑنے، نوادر جمع کرنے اور کچھ ایسی ہی دیوانگی کا مظاہرہ کرنے آتے ہیں۔

"مسٹر ٹریلانی نے چند مصری راہبروں (گائیڈز) قلیوں اور اونٹوں کا انتظام بھی کیا اور تقریباً پندرہ دِن کے مُسلسل سفر اور آوارہ گردی کے بعد ایک روز رات کے پچھلے پہر ہم نے اپنے آپ کو ایک ایسے مقام پر پایا جس کا ذکر فان ہیُون نے کیا تھا۔ یہ وہی "ساحر کی وادی" تھی جس میں بے شمار عمودی اور بلند نکیلی چٹانیں صدیوں سے سینہ تانے کھڑی تھیں۔

"علی الصباح ہمارا مختصر سا قافلہ وادی میں داخل ہو چکا تھا اور فان ہیُون کے سفرنامے کی عبارتیں ایک بار پھر ہمارے ذہنوں میں تازہ ہو رہی تھیں۔ پناہ خُدا، کیسی خوفناک اور ویران جگہ تھی۔ ہر طرف بے آب و گیاہ برہنہ چٹانیں ہی چٹانیں۔ ایک بے کراں سکُوت... ایک اذیت ناک سنّاٹا... جو ہر شے کو نگل جانا چاہتا تھا۔

"فضا میں حدت بڑھتی جا رہی تھی، لیکن ہم رُکے بغیر مُسلسل آگے بڑھ رہے تھے۔ ہماری بےقرار نگاہیں تین سو فٹ اونچی اس چٹان کو تلاش کر رہی تھیں جس کا ذکر فان ہیُون نے کیا تھا۔ تیسرے پہر — ہم ایک چٹان کی آڑ میں پڑاؤ کرنے کا ارادہ کر رہے تھے کہ سب سے آگے جانے والا ایک گائیڈ اپنے اونٹ کو دوڑاتا ہُوا ہماری جانب آیا اور چلّا چلّا کر کہنے لگا:

"مَیں نے ایک عجیب چیز دیکھی ہے۔"

"اُس کی آنکھیں باہر کو اُبلی پڑ رہی تھیں اور سانس بُری طرح پھُول رہا تھا۔ اُس کا اونٹ بھی خلافِ معمُول گھبرایا ہُوا اور خوف زدہ سا تھا۔ چند لمحے بعد اُس نے ہمیں اپنے ساتھ لیا اور مختلف چٹانوں میں سے ہوتا ہوا بالاخر ایک کھُلی جگہ جا نِکلا۔ مَیں کہہ نہیں سکتا کہ مسٹر ٹریلانی کی قلبی کیفیت کیا تھی، مگر مجھ پر جو گزری، اُسے بیان کرنے سے اپنے آپ کو عاجز پاتا ہوں — قاہرہ کے وہ تینوں اہرام جنھیں دنیا

کے ہفت عجائبات میں سرِفہرست رکھا گیا ہے ؛ اگرچہ عظیم ہیں مگر اس ہَرَم کے سامنے، جو ہم نے "ساحر کی وادی" میں دیکھا، اُن تینوں اہرام کی کوئی حیثیت نہ تھی۔ اس کی بلندی تین سو فٹ سے بھی زاید تھی، لیکن ڈیزائن ایسا نرالا اور اتنا حیرت انگیز کہ دیر تک ہمارے مُنہ سے کوئی لفظ نہ نکل سکا۔ ہماری نظروں کے سامنے نہایت باوقار اور شاہانہ شان و شوکت لیے ہوئے ایک ایسی ملکہ کا تین سو فٹ اُونچا مجسمہ کھڑا تھا جس کے اعضا کا تناسب اتنا درست تھا کہ ابوالہول کے چہرے کے تناسب سے اُسے کوئی نسبت نہیں دی جا سکتی تھی۔

"چونکہ تم فان ہیُون کی کتاب میں اس ہَرَم کے تفصیلی حالات دیکھ چکے ہو، اس لیے مَیں مزید تفصیل میں نہ جاؤں گا۔ ہم نے اپنے مصری ساتھیوں کو وہیں چھوڑا اور خود اس ہرم کے قریب پہنچے۔ مَیں یہ عرض کرنے میں کوئی ندامت محسوس نہ کروں گا کہ اُسے اپنے قریب پا کر ہم پر بھی دہشت اور مسرّت کی ایک ملی جُلی کیفیت طاری تھی۔ پہلی نظر ہی میں معلوم ہو گیا کہ یہ ہَرَم کم از کم پچاس صدیاں پرانا ہے، لیکن اس پر کھُدے ہوئے رنگین نقش و نگار کی آب و تاب ماند نہ پڑی تھی۔ جُوں جُوں ہم اس پر جمی ہوئی ریت ہٹاتے، نیچے سے چمک دار نقوش برآمد ہوتے جاتے۔ یہ نقوش دراصل پرانی تصویری زبان تھی جو فرعونوں کے دَور میں لکھی جاتی تھی اور جسے آج کل کی اصطلاح میں "مردہ زبان" کہنا چاہیے اور اس زبان کو اب خود مصری لوگ بھی نہیں پڑھ سکتے۔ مگر ہم اسے بالکل اسی طرح پڑھ لینے پر قادر تھے جس طرح کوئی انگریزی، فرانسیسی، عربی یا جرمن زبان کی پرانی کتاب پڑھ لیتے ہیں۔

"ان عبارتوں کے مطالعے سے معلوم ہُوا کہ یہ مصر کی ایک قدیم حکمران ملکہ تارا کا ہَرَم ہے جو شہنشاہ انیتف کی بیٹی تھی اور شہنشاہ انیتف کی حکومت مصر کے شمالی اور جنوبی علاقوں پر قائم تھی۔

"ایک گھنٹے کی تھکا دینے والی جدّوجہد کے بعد ہم اس تراشی ہوئی چٹان کی چوٹی پر چڑھنے میں کامیاب ہو گئے۔ ہمارے دل بُری طرح دھڑک رہے تھے اور

بدن پسینے میں شرابور —— آسمان سے سُورج آگ برسا رہا تھا، لیکن ہم ان تمام تکلیفوں سے بے نیاز جلد از جلد مقبرے کے اندر پہنچ کر اپنی آنکھوں سے ملکہ تارا کی ممی کو دیکھنا چاہتے تھے۔ چپّے چپّے پر فان ہیُون کی تحریر کردہ شہادتیں بکھری ہوئی تھیں۔ مقبرے کے دروازے پر پتھّر کی ایک عظیم اور انتہائی وزنی سِل رکھی نظر آئی جو ذرا ایک طرف ہٹی ہوئی تھی اور اس میں سے اوسط جسامت رکھنے والا آدمی بخیر و خوبی گزر سکتا تھا۔

"یہ ہے وہ دروازہ جسے فان ہیُون کے عرب ساتھیوں نے اپنی جگہ سے ہٹایا تھا۔" مسٹر ٹرِیلانی نے پیشانی سے پسینہ سونتتے ہوئے کہا۔ "اُف خدایا! دو سو برس گزر جانے کے باوجود یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کل کی بات ہو.... آہ ... یہ دیکھو.... دیکھتے ہو؟" اُنھوں نے اُنگلی سے اُس کئی من وزنی سِل کے پچھلے حصّے کی طرف اشارہ کیا جہاں انسانی قدموں کے مدّھم نشان صاف نظر آ رہے تھے۔ یہ نشان اس درز کے قریب پھیلے ہوئے گھُپ اندھیرے میں غائب ہو گئے تھے۔ ہم نے اپنی اپنی ٹارچیں روشن کیں اور ایک دوسرے کے پیچھے اندر چلے۔

"وہی عجیب سحر انگیز مسالوں کی خوشبو ہماری ناک میں آئی جس کا ذکر فان ہیُون نے کیا تھا، لیکن یہ اُس خوشبُو سے کچھ الگ تھی جو اکثر ممیوں کے تابوتوں اور مقبروں میں پھیلی ہوتی ہے۔ اُس وقت ہم پر دہشت، مسرّت، حیرت اور اضطراب کی ایسی حالت طاری تھی جو ناقابلِ بیان ہے۔ سُورج غروب ہونے میں ابھی کئی گھنٹے باقی تھے اور ہمیں پُورا اطمینان تھا کہ اس وقفے سے فائدہ اُٹھا کر ہَرَم کے اندرونی اور بیرونی حصّوں کا تفصیلی مشاہدہ کریں گے۔

"ٹارچوں کی تیز روشنیاں ہماری راہنمائی کر رہی تھیں۔ چند لمحوں بعد ہم نے اپنے آپ کو ایک گہری اور سَرد سرنگ یا راہداری میں کھڑے پایا۔ اِس سرنگ کی دونوں دیواروں، فرش اور چھت پر بھی لاتعداد نقش و نگار اور عبارتیں کندہ

تھیں۔ چوپایوں کی شکلیں، پرندوں کی شکلیں، درختوں اور انسانوں کی شکلیں۔ انہی کے ذریعے اِس ہرَم کی پُوری تاریخ سمجھی جا سکتی تھی۔ یہ نقوش حد درجہ جاذبِ نظر تھے اور صاف معلوم ہوتا تھا کہ جن ہاتھوں نے انہیں دائمی حُسن بخشا

ہے، وہ کوئی معمُولی ہاتھ نہ تھے۔ ہر تصویر مُصوّر کا خاص شہکار بنی ہوئی تھی اور اس سے پیشتر ایسے نقش و نگار ہم نے مِصر کے پرانے مقبروں میں کبھی نہ دیکھے تھے رنگوں پر جب روشنی پڑتی تو وہ دمکنے لگتے اور تصویروں میں جیسے جان پڑ جاتی۔ خُدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اس کی تعمیر میں کتنا وقت صَرف ہُوا اور کتنے فن کاروں، مزدوروں اور معماروں نے اس کے لیے اپنا خُون پسینہ ایک کیا تھا۔

"یہ ہرَم اُس مجسّم چٹان کو کاٹ کر بنایا گیا تھا اور اِس میں اجنتا اور ایلورا کے عجائبِ زمانہ غاروں کی مانند کوئی جوڑ اور کوئی زخم نہ تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ معماروں کے ہاتھ لگتے ہی یہ پتھر موم بن جاتا اور وہ اسے جس شکل میں چاہتے، تبدیل کر دیتے تھے۔ ہم دونوں، پاگلوں کی طرح، ایک ایک چیز کو دیکھتے اور سر دُھننے لگتے۔ نقل کرنے یا کسی چیز کی تفصیلات قلم بند کرنے کا موقع تھا اور نہ ہمیں اِس کا ہوش۔

"اِس کے بعد ہم نے وہ تابوت دیکھا جس میں ملکہ تارا کی لاش رکھی تھی تابوت کا ڈھکنا ایک طرف سنگین فرش پر پڑا تھا۔ اِس پر شیخ صوُما کے بد خادموں نے نہایت بیدردی سے ہتھوڑے برسائے تھے اور اس کا سارا حُسن و جلال غارت کر دیا تھا۔ ملکہ تارا اس کُھلے تابوت میں موجود تھی۔ اس کے چہرے پر نظر ڈالتے ہی ہم مبہُوت ہو کر رہ گئے۔ اس سے پہلے ہم ہزارہا ممیاں دیکھ چکے تھے، لیکن یہ پہلا اتفاق تھا کہ ایسی ممی ہماری نظروں کے سامنے پڑی تھی جسے کسی صُورت میں بھی "مُردہ" کہنا دُرست نہ تھا۔ اس کا چہرہ تر و تازہ اور شاداب تھا اور گلاب کی پنکھڑیوں کے سے ترشے ہوئے لبوں پر ملکوتی تبسم کھیل رہا تھا جیسے وہ آنکھیں بند کیے کوئی سہانا سپنا دیکھ رہی ہو۔ اس کا بایاں مرمریں بازو سینے پر دَھرا تھا۔

لیکن دایاں بازو کہنی پر سے کٹا ہوا تھا اور وہ سات انگلیوں والا ہاتھ وہاں نہ تھا جس کا ذِکر فان ہیوُن نے کیا ہے؛ تاہم اس کٹی ہوئی کہنی پر جما ہُوا خون زیادہ پرانا نہ تھا اور جب ہم نے غور سے اس کا معائنہ کیا تو یہ جان کر جسم میں تھرتھری سی چھوٹ گئی کہ اِس زخم میں سے خون رِستا رہا ہے —— مگر یہ لاش تو پانچ ہزار سال پُرانی تھی —— بھلا اس کٹے ہوئے بازو میں سے خُون کیونکر رِس سکتا ہے۔؟

"تابوت کے ڈھکنے پر ملکہ تارا کی پُوری "سوانح حیات" درج تھی جسے ہم نے خاصی دیر مغز ماری کے بعد پڑھا —— چونکہ یہ چیز فان ہیون کے سفرنامے میں نہیں ہے اور ہو بھی کیسے سکتی تھی جبکہ وہ قدیم مصری زبان سے نابلد تھا، اِس لیے مَیں تمہیں مختصر الفاظ میں اس ملکہ کے بارے میں بتاتا ہوں:

"مسیحؑ کی پیدائش سے کوئی تین ہزار برس قبل مِصر میں ایک عظیم شان و شوکت رکھنے والا فرعون برسرِ اقتدار آیا۔ اس کا نام تھا انتیف —— شہزادی تارا اِسی کی بیٹی تھی۔ اس کے علاوہ انتیف کی کوئی اولادِ نرینہ نہ تھی۔ وہ بچپن ہی سے غیر معمولی طور پر ذہین اور دانش مند تھی اور اس کا باپ اس سے بڑی محبت کرتا تھا۔ علم و حکمت اور عقل و خرد میں لاثانی ہونے کے ساتھ ساتھ شہزادی تارا حسن و جمال کی دَولت سے بھی مالا مال تھی۔ اس کا باپ فرعون انتیف بھی نہایت عالم فاضل اور مُدبّر تھا۔ اُس نے نہ صرف مِصر کے مایۂ ناز کاہنوں اور پُجاریوں کو اپنی بیٹی کا اتالیق مُقرر کیا، بلکہ بے شمار علوم و فنون خود بھی سکھائے؛ حتیٰ کہ وہ "کالا علم" بھی اُسے سکھا دیا جس کے زور سے شہزادی تارا نے عناصرِ اربعہ آگ، پانی، مٹی اور ہوا پر قابو پا لیا تھا (قدیم مصر کی داستانوں میں ہمیں اکثر ایسے عجیب و غریب لوگوں کا ذکر ملتا ہے جو نہ صرف عناصرِ اربعہ پر قابو رکھتے تھے، بلکہ اُنھیں مَوت پر بھی پُورا پُورا اختیار حاصل تھا)، اِس کے علاوہ شہزادی تارا اپنی قوتِ ارادی کو اس حد تک بڑھا چکی تھی کہ اپنی خواہش کے مطابق مسلسل سوتی یا مسلسل جاگتی۔ ایک مرتبہ تو وہ ایسے ہی تیار کرائے گئے مقبرے میں تقریباً

ایک مہینے تک تابوت میں بند رہی اور زندہ سلامت باہر نکل آئی۔

اپنی رحم دلی، ہمدردی اور اچھے اخلاق کے باعث وہ پورے ملک کے عوام کے دلوں کی دھڑکن بن چکی تھی اور ہر ایک کی زبان پر اس کی خوبصورتی اور دانش مندی کے چرچے تھے۔ فرعون انیتیف جب عدالت لگاتا تو اکثر مقدموں کے فیصلے شہزادی تارا ہی کرتی اور کبھی اس نے کسی سے بے انصافی نہیں کی۔

ان دنوں مصر میں دیوتاؤں کے پجاریوں کو بھی بڑا اثر و اقتدار حاصل تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ فرعون انیتیف اور اس کی جانشین بیٹی شہزادی تارا انہی کے اشاروں پر چلے۔ سب سے بڑا پجاری خود تاج و تخت سنبھالنے کی فکر میں تھا اور اُس نے اپنے ساتھ تمام دوسرے پجاریوں کو بھی ملا لیا تھا۔ فرعون انیتیف کو پجاریوں کی ان سازشوں کا فوراً پتہ چل گیا۔ اس نے فوج کے ذریعے اس سازش کو عارضی طور پر کچل دیا، لیکن یہ خدشہ برابر اس کے دل میں موجود رہا کہ میری موت کے بعد یہ پجاری میری بیٹی شہزادی تارا کو کبھی چین سے حکومت نہ کرنے دیں گے اور اس کے راستے میں رکاوٹیں اور دشواریاں پیدا کریں گے۔ چنانچہ فرعون انیتیف نے اس سلسلے میں دو کام کیے۔ پہلا تو یہ کہ شہزادی تارا کی حفاظت کے لیے فوج کے کئی جاں نثار دستے بنائے اور ان سے حلف لیا کہ وہ شہزادی کے پسینے کی جگہ اپنا خون بہانے کو مستعد رہیں گے۔ دوسرا کام یہ کیا کہ شہزادی کو "کالا علم" سکھایا تا کہ وہ اپنی حفاظت خود بھی کر سکے۔ اس کے علاوہ اسے مصوری اور نقاشی کے فنون سے بھی آشنا کرایا گیا۔ میں نے خود اس کے مقبرے کی ایک دیوار پر یہ الفاظ لکھے دیکھے ہیں:

شہزادی تارا ——— عظیم مصوری کی عظیم محافظ۔

اور یہ عین ممکن ہے کہ مقبرے کے اندر جو بے مثال نقاشی کی گئی ہے، اس کا بڑا حصہ شہزادی ہی نے بنایا ہو۔ بہرحال فرعون انیتیف نے اپنی بیٹی کو کالا علم سکھایا اور اسی کی مدد سے اُس نے اس کائنات کی بے شمار خفیہ قوتوں پر قابو

پالیا۔ آپ انہیں شیطانی قوتیں بھی کہہ سکتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے میرے عزیز کہ ہماری اس خوبصورت کائنات میں کچھ پُراسرار عنصر ایسا بھی شامل ہے جس کی کارنمائیاں محیر العقل ہیں اور جس کے بارے میں ہم ——— یعنی سائنس دان لوگ کچھ بھی نہیں جانتے ———

"شہزادی تارا نے سب سے پہلے "نیند" پر قابو پایا۔ یہ نہایت دشوار مرحلہ تھا۔ آپ کو معلوم ہے نیند انسان کے لیے کس قدر اہم اور ضروری ہے۔ آپ زیادہ سے زیادہ تین دن جاگ سکتے ہیں۔ اس کے بعد آپ کے اعصاب شل ہونے شروع ہو جائیں گے۔ یہ مقولہ بالکل سچ ہے کہ نیند سُولی پر بھی آجاتی ہے، مگر شہزادی تارا پر "نیند کی دیوی" کچھ ایسی مہربان ہوئی کہ وہ مہینوں تک پلک نہ جھپکاتی تھی۔ یہ بات یقینی ہے کہ ایک مرتبہ وہ مہینہ بھر سانس روک کے اپنے مقبرے میں پڑی رہی۔ لیکن جب مقبرے سے باہر آئی تو بڑے پجاری نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ شہزادی تارا کے بھیس میں یہ کوئی اور عورت ہے ——— شہزادی تارا تو اپنے تجربے کے دوران میں مر گئی تھی وغیرہ وغیرہ ——— لیکن شہزادی تارا نے بڑے پجاری کی اس بکواس کو غلط ثابت کر دیا۔ یہ تمام داستان بھی میں نے مقبرے کی دیواروں پر لکھی ہوئی دیکھی۔

"فرعون انیتیف کو زہر سے ہلاک کر دیا گیا۔ یہ سازش بھی پجاریوں کی تھی ملک کے رسم و رواج کے مطابق فوج نے شہزادی تارا کو اپنا حکمران تسلیم کر لیا، مگر جلد ہی ملک میں شورش برپا ہونے لگی اور بغاوت کے آثار دکھائی دینے لگے۔ شہزادی تارا نے ان بغاوتوں کو بڑی ہوشیاری سے کچل دیا۔ میدانِ جنگ میں وہ فوجی وردی پہن کر آتی اور خود اپنی فوج کی کمان کرتی۔ ہم نے اس مقبرے کے اندر ملکہ تارا کی اکثر ایسی تصویریں بھی دیکھیں جن میں وہ مردانہ شاہی لباس پہنے ہوئے ہے۔ یہ تصویریں شاید اُس موقع کی ہیں جب وہ تخت نشین ہوئی ہوگی۔ بعض تصویروں میں وہ شہزادیوں کا لباس پہنے ہوئے تھی اور سر پر شاہی تاج

بھی رکھا تھا۔

"اِس دوران میں اس نے اپنا یہ عالی شان ہَرَم بھی تیار کرایا اور کالے علم کی بھی مُسلسل مشق جاری رکھی؛ حتیٰ کہ ماضی، حال اور مستقبل کے تمام واقعات اُس کے سامنے روزِ روشن کی طرح عیاں ہونے لگے۔ اُسے غیبی طاقتوں نے بتایا کہ جب وہ پیدا ہوئی تو سات ستاروں کا جمگھٹ اُس کی حفاظت کر رہا تھا اور جب تک وہ اِن سات ستاروں کو اپنے ساتھ رکھے گی، دنیا کی کوئی طاقت اُسے فنا نہیں کر سکتی۔ شہزادی تارا کو اِس بات پر پُورا پورا یقین تھا کہ واقعی سات ستارے اس کی حفاظت پر مامور رہیں۔ شہزادی کے دائیں ہاتھ پر انگلیوں کی تعداد بھی سات تھی۔

اَب مجھے ایک اور بات یاد آئی۔ وہ یہ کہ شہزادی تارا نے اپنے مقبرے کے ایک ستون پر بڑے پُجاری کا حال تفصیل سے لکھوایا ہے اور اس میں یہ خوف ظاہر کیا ہے کہ یہ پجاری زبردست قوتوں کا مالک ہے اور میرا کالا علم اس پر اثر نہیں کر سکتا۔ وہ یقیناً میری موت کے بعد میرے نام کو مٹانے کی ناپاک کوشش کرے گا ..... اس لیے میرے لیے اس کا تدارک کرنا ضروری ہو گیا ہے ....

مِسٹر مالکم رُوز .... یہ یاد رکھیے کہ پُرانے مصر میں کسی کا نام مٹانا یا مٹانے کی کوشش کرنا نہایت ذلیل کام سمجھا جاتا رہا ہے۔ اسے آپ انتقام کی بھی ایک شکل سمجھ سکتے ہیں۔ قدیم مصری عقیدہ یہ تھا کہ کوئی بے نام رُوح اپنے محبوب دیوتا کی خوشنودی حاصل نہیں کر سکتی۔ اس کے لیے نام کا ہونا ضروری ہے؛ چنانچہ جب غیبی طاقتوں نے شہزادی کو سات ستاروں کی خبر دی تو شہزادی نے اپنے علم کے ذریعے اِن ستاروں سے ہر وقت کام لینے کا منصوبہ بنا لیا۔ اُس نے ایک بیش قیمت اور بڑے یاقوت کو بھونرے کی شکل میں ترشوایا اور اس پر سات ستارے نقش کرائے۔

"بھونرے کی شکل میں کیوں ترشوایا؟" ___ مَیں نے اِس دوران میں پہلی مرتبہ زبان کھولی۔

"آہ ___ اس کی تشریح کرنا پڑے گی ___" کاربیک نے کہا۔

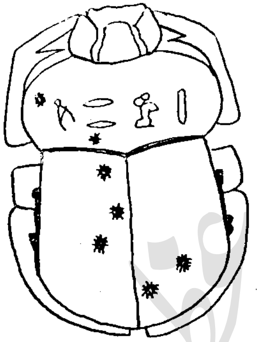

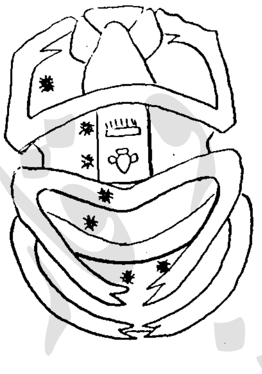

"بات یہ ہے کہ قدیم مصر میں بھونرے کو بڑی مقدس اور متبرک حیثیت حاصل رہی ہے۔ مصری سمجھتے تھے کہ اس ننھی سی بھن بھن کرنے والی مخلوق میں بے شمار پُراسرار قوتیں چھپی ہوئی ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ بھونرا ہے بھی عجیب و غریب مخلوق ___ مصریوں کا خیال تھا کہ بھونرے کو زندہ رہنے کے لیے ہوا کی ضرورت نہیں ہوتی اور نہ پانی کی ___ وہ برسوں مٹی میں دبا رہے تب بھی زندہ رہتا ہے، آگ میں ڈال دو تو جلتا نہیں۔ وہ دوستوں کا بہترین دوست اور دشمنوں کا دشمن ہے وغیرہ وغیرہ ___ ہزاروں برس پیشتر مصر میں بھونرا بادشاہوں کی خاص علامت اور نشان ہے اور ان کے اہرام میں جا بجا بھونرے کی چھوٹی بڑی تصویریں دکھائی دیتی ہیں۔

"سات ستاروں والا بھونرے کی شکل کا یہ یاقوت، جس پر ناقابلِ فہم طلسم کندہ ہے، شہزادی تارا کی زندگی تک اُس کی حفاظت کرتا رہا اور جب وہ مر گئی تب بھی اس کی حفاظت سے غافل نہیں رہا۔ شہزادی تارا چونکہ ہوا، پانی، آگ اور مٹی پر حکومت کرتی تھی، اس لیے یہ چاروں عنصر بھی اس کی حفاظت کرتے ہیں۔ مرنے سے پہلے اُس نے اپنے علم کے زور پر دایاں ہاتھ کہنی سے کٹوایا اور اس ہاتھ کو کپڑوں کی پٹیوں میں لپیٹے بغیر، جیسا کہ ممی کو ایسی بے شمار پٹیوں میں لپیٹ کر تابوت میں رکھا جاتا ہے، سینے پر رکھ دیا۔ اب جہاں تک اس دنیا میں ہوا ہے، یہ ہاتھ

شہزادی تارا کی حفاظت اور نگرانی کے لیے اس کے ساتھ ساتھ رہے گا اور جو شخص بھی بُری نیّت سے شہزادی تارا کی ممی کے پاس جائے گا، یہ ہاتھ اس شخص سے بھیانک انتقام لے گا۔

"اسی تابوت کے اندر شہزادی کی لاش کے پائنتی ہم نے سات گوشوں والا ایک قیمتی ڈبا بھی دیکھا جو کوشش کے باوجود کھُل نہ سکا۔ یہ ڈبا آپ نے مسٹر ٹریلانی کی خواب گاہ میں دیکھا ہوگا۔ جب ہم نے تابوت میں سے اس ڈبے کو اُٹھایا تو یہ بے حد وزنی تھا اور کسی نہ معلوم مسالے سے بنایا گیا تھا۔ اس کے اُوپر بعض اُبھار ایسے تھے جن پر پُراسرار علامتیں اور نشان نقش تھے۔ ان کا مطلب ہماری سمجھ میں نہ آسکا، تاہم اس کی دوسری طرف تصویری خط میں ایک باریک سی تحریر نظر آئی جس سے پتہ چلا کہ شہزادی تارا نہایت گہری نیند کی آغوش میں ہے اور اس کی رُوح سات ستاروں کی مقدس روشنی کی مانند فضا میں موجود رہے گی اور اپنے جسم کی حفاظت کرے گی۔ اس رُوح کو اختیار حاصل ہے کہ جب چاہے، اپنے جسم میں دوبارہ داخل ہو جائے۔

"جب تک یہ ڈبا ہمارے ہاتھوں میں رہا، ہم پر رونگٹے کھڑے کر دینے والی کیفیت طاری اور کان میں کوئی آواز یہ کہتی سنائی دی: اسے یہاں مت کھولنا .... اسے یہاں مت کھولنا .... اگرچہ اس ڈبے کے اُوپر ڈھکنا لگا ہوا تھا لیکن اسے کھولنے کا کوئی کھٹکا نظر نہ آتا تھا اور یہ ڈھکنا اتنی سختی سے بند تھا کہ معمولی سی درز بھی نہ تھی۔ یقیناً اس میں کوئی پُراسرار شئے پوشیدہ ہوگی، کیونکہ ڈبا بڑی حکمت سے تیار کیا گیا تھا اور اندر ہی سے بند تھا۔

"ساحر کی وادی" میں ہم نے کئی دن اور کئی راتیں قیام کیا۔ اس عرصے میں کوئی قابلِ ذکر واقعہ پیش نہ آیا اور ہمارے مصری ساتھیوں کا خوف بھی کسی حد تک دور ہو گیا۔ اس دوران میں ہم نے مقبرے کے اندر بنی ہوئی تمام تصویروں اور نقوش کی نقلیں تیار کر لیں اور وہ تمام اشیا جنھیں ہم ساتھ لے جا سکتے تھے، مقبرے

سے نکال لیں۔ شہزادی تارا کا تابوت بڑی مشکل سے نکالا اور اسے بھی ساتھ لے جانے کی تدبیریں کرنے لگے۔ یہ ایک خطرناک اور انتہائی جان لیوا کام تھا۔ مصری قُلی بمشکل اس مرحلے پر ساتھ دینے کے لیے تیار ہوئے۔ جونہی ان کی نظریں شہزادی تارا کے چہرے اور کٹے ہوئے بازو پر پڑیں، وہ سب کے سب دہشت سے تھر تھر کانپنے لگے۔

اونٹوں پر تمام سامان لاد کر ہم وہاں سے نکل کھڑے ہوئے۔ روانگی سے پہلے ہم نے رسّی کی بنی ہوئی سیڑھی اور اپنا دوسرا فالتو سامان وہیں چٹان کے قریب زمین میں دفن کر دیا تاکہ پھر کبھی اس کی ضرورت پیش آئے تو وہاں سے حاصل کیا جا سکے۔

"ایک دن اور ایک رات سفر کرتے ہوئے صحرا کے ایسے حصّے میں پہنچے جہاں کسی قافلے کے قیام کے نشان بکھرے ہوئے تھے اور پھر یہیں ریت کے تودے میں سے انسانی ڈھانچا برآمد ہوا۔ مسٹر ٹریلانی کا خیال تھا کہ دو صدیاں پہلے فان ہیون کا قافلہ بھی ادھر ہی سے گزرا ہوگا اور کیا عجب کہ یہ ڈھانچا شیخ صوما یا اُس کے کسی ساتھی کا ہو جسے بقول فان ہیون شہزادی تارا کے کٹے ہوئے ہاتھ نے مار ڈالا تھا۔

"اُسی رات پچھلے پہر ایک ہولناک طوفان آیا۔ ریت کے بڑے بڑے تودے اور ٹیلے رُوئی کے دُھنکے ہوئے گالوں کی طرح اُڑ رہے تھے اور ہوا کے بے پناہ شور سے کانوں کے پردے پھٹے جاتے تھے۔ صبح کے وقت طوفان تھما اور ہم نے اپنے سامان کا جائزہ لیا اور یہ دیکھ کر پیروں تلے کی زمین نکل گئی کہ تابوت تو موجود ہے، لیکن شہزادی تارا کی ممی اس میں سے جا چکی تھی۔ ہم نے اپنے ساتھیوں کو شمار کیا۔ معلوم ہوا تین صحرائی غائب ہیں۔

"مسٹر ٹریلانی کو نہ جانے یہ یقین کیوں ہو گیا تھا کہ شہزادی تارا کی ممی اسی مقبرے میں ملے گی جہاں سے ہم اُسے لائے تھے۔ اُن کو یہ بھی خدشہ تھا کہ جن تین مصری

صحرائیوں نے یہ شرارت کی ہے، اُن میں سے کوئی جیتا نہ ملے گا —— جب ہم نے مقبرے کی طرف واپس جانے کا ارادہ کیا تو مصری قلیوں اور ان کے سردار نے دبے الفاظ میں انکار کیا اور گڑگڑا کر کہنے لگے:

"ہمیں وہاں نہ لے جائیے، وہ ہم سب کو مار ڈالے گی۔"

"مسٹر ٹریلانی نے کچھ سوچ کر کہا: "جب تک ہم واپس نہ آجائیں، تم لوگ یہیں ٹھہرے رہو۔"

"میں آپ کی واپسی کا صرف تین دن انتظار کروں گا" عرب شیخ نے جواب دیا۔ "اس کے بعد واپس چلا جاؤں گا۔"

"ہم نے اپنے اونٹوں پر ضروری سامان لدوایا اور ہرم کی جانب روانہ ہوگئے یہ انتہائی خوف ناک اور اعصاب شکن سفر تھا، لیکن ہم کسی غیبی مدد کے سہارے آگے بڑھتے گئے اور صحرا کی ویرانی ہمیں ڈرا نہ سکی۔ ہرم کے نزدیک پہنچتے ہی کچھ ایسی نشانیاں اور علامتیں دکھائی دیں جن سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہاں کوئی شخص اس دوران میں آیا ہے اور ہرم کے اندر اُتر کر نہ معلوم کیا حرکتیں کرتا رہا ہے۔ جس گہرے اور تاریک گڑھے میں ملکہ تارا کا تابوت پڑا تھا، وہاں اُترنے کے لیے اُس نے ایک مضبوط رسا بھی لٹکایا تھا۔ ہم نے رسّی کی سیڑھی زمین کھود کر نکالی اور ٹارچوں کی روشنی میں دیکھتے بھالتے گڑھے میں اُترے۔ ایک لمحے کے لیے میرے بدن پر کپکپی سی طاری ہوئی یہی کیفیت مسٹر ٹریلانی کی تھی۔ ہم نے دیکھا کہ شہزادی تارا کی لاش گڑھے میں ایک جانب اسی انداز میں پڑی ہے جس انداز میں وہ تابوت کے اندر پڑی رہتی تھی۔ اس کے دونوں بازو سینے پر بندھے ہوئے تھے اور لبوں پر وہی ملکوتی تبسّم تھا، لیکن جس منظر نے ہمیں دہلا دیا، وہ یہ تھا کہ دائیں بائیں انہی تین صحرائیوں کی لاشیں پڑی تھیں جو اُسے لے کر بھاگے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا ان بدنصیبوں کی موت انتہائی دہشت اور اذیت ناک حالات میں واقع ہوئی ہے۔ اُن کے چہرے کوئلے کی مانند سیاہ تھے اور خون کے لوتھڑے منہ، ناک، کانوں اور اُبلی ہوئی آنکھوں

سے نکل نکل کر سارے جسم پر پھیل گئے تھے۔ ہم نے جُھک کر ان کے چہروں کو بغور دیکھا۔ ہر گردن پر سات اُنگلیوں کے نشاں واضح طور پر نظر آرہے تھے۔ مسٹر ٹریلانی نے یک لخت میرا بازو سختی سے تھام لیا اور اُن کی اُنگلیاں میرے بازو میں جیسے گڑ کر رہ گئیں:

"دیکھو" اُنہوں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"آہ —" میرے مُنہ سے اس لفظ کے سوا کچھ اور نہ نکل سکا۔

شہزادی تارا کے سینے پر سات اُنگلیوں والا کٹا ہوا مرمریں ہاتھ دھرا تھا۔ اُنگلیاں نہایت نرم تھیں اور اُن کے ناخن ایک ایک انچ لمبے تھے۔ کلائی کا وہ حصّہ، جہاں سے یہ ہاتھ کاٹا گیا تھا، ابھی تک خُون آلود تھا اور اس میں سے گویا ابھی تک خون کے قطرے گرتے دکھائی دیتے تھے۔

"کچھ یاد نہیں، ہم کتنی دیر مبہوت ہو کر کٹے ہوئے حسین ہاتھ کو دیکھتے رہے۔ اُسے چھونے کی ہمّت نہ ہوتی تھی اور مسٹر ٹریلانی کے لیے میرا مشورہ یہی تھا کہ ان تینوں صحرائیوں کا ہولناک حشر دیکھ کر ہمیں عبرت پکڑنی چاہیئے اور بہتر یہی ہے کہ شہزادی تارا کو یہاں سے لے جانے کا ارادہ ترک کر دیا جائے؛ ورنہ یہی ہاتھ ہمارا گلا بھی گھونٹ سکتا ہے۔

"مسٹر ٹریلانی نے میرے اس مشورے سے اتفاق نہ کیا۔ سات ستاروں والا یاقوت اپنی جیب سے نکال کر بائیں ہاتھ میں پکڑا اور پھر آہستہ سے شہزادی تارا کا کٹا ہُوا ہاتھ اُٹھا کر پورے احترام سے اپنے کوٹ کی جیب میں رکھ لیا۔

"آؤ کاربیک، اب شہزادی کو اُٹھا کر لے چلیں۔ مَیں نہیں چاہتا کہ وہ ان منحوس صحرائیوں کے پاس پڑی رہے اور اس کی بے حرمتی ہو۔"

"مسٹر ٹریلانی کی آواز میں کچھ ایسی محبت شہزادی کے لیے جھلک رہی تھی کہ میں حیران رہ گیا۔ مَیں نے ایک نظر اُن کے چہرے کی طرف دیکھا۔ احساس ہوا کہ تھوڑی دیر پہلے خوف کی جس کیفیت سے ہم دوچار تھے، اب وہ کیفیت باقی نہیں

رہی۔ اس کی جگہ ایک عجیب قسم کی مسرّت انہیں حاصل ہو رہی تھی۔
"ڈرو نہیں میرے دوست، یہ شہزادی ہماری دوست ہے —— دشمن نہیں۔ وہ میرے کان میں کہہ رہی ہے کہ ان بدمعاشوں نے صدیوں سے اُسے تنگ کر رکھا۔ اس کے آرام میں خلل ڈالا ہے اور اب وہ خود یہاں رہنا نہیں چاہتی۔ وہ ساتھ جانے کے لیے تیار ہے۔"

"مسٹر ٹریلانی نے میرے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے یہ بات کہی اور مَیں نے جواب دیے بغیر جھک کر شہزادی تارا کو ایک نرم و نازک اور تر و تازہ پھول کی مانند اپنے بازوؤں میں اُٹھا لیا، پھر ہم دونوں بخیر و عافیت ہَرم سے باہر آ گئے۔

"عرب شیخ اپنے وعدے کے مطابق، دوسرے قلیوں کو لیے ہوئے وادی کے سرے پر ہمارا منتظر تھا۔ شہزادی تارا کی ممی کو یُوں کُھلا دیکھ کر ان پر خوف کی جو حالت ایک بار پھر طاری ہوئی، بیان سے باہر ہے؛ چنانچہ مَیں نے محسوس کر کے کہ اگر ممی زیادہ دیر ان کی نگاہوں کے سامنے رہی تو دہشت سے ان کے دِلوں کی حرکت رُک جائے گی، اُسے دوبارہ تابوت میں بند کر دیا۔

"کسی حادثے اور آفت کا سامنا کیے بغیر ہم قاہرہ پہنچ گئے۔ جس روز ہم قاہرہ پہنچے، اُسی روز مسٹر ٹریلانی نے مجھے بتایا اُن کی بیوی اسکندریہ میں ہے اور چونکہ وہ ایک بچّے کی ماں بننے والی تھی، اس لیے اُسی روز اُسے اسکندریہ کے سرکاری ہسپتال میں داخل کرا آئے تھے۔ اَب خدا معلوم اس کا کیا حال ہے۔ اُس نے بچّے کو جنم دیا یا نہیں۔ مسٹر ٹریلانی اسکندریہ کے ہسپتال کے بڑے ڈاکٹر کو، جو اُن کا دوست تھا، تار دینے کا ارادہ کر رہے تھے کہ کمرے کا دروازہ کُھلا اور ہوٹل کا ملازم ایک طشتری اُٹھائے اندر آیا۔ اس طشتری میں تار کا لفافہ رکھا تھا۔ اُسے دیکھتے ہی میرے دِل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ لیکن مسٹر ٹریلانی نے کسی گھبراہٹ کا مظاہرہ کیے بغیر لفافہ اُٹھایا اور تار کا مضمون پڑھا۔ چند ثانیوں کے لیے اُن کے چہرے کی رنگت بدلی، پھر وہ پرزہ کاغذ میری جانب بڑھا دیا۔

یہ تار اسکندریہ کے اسی ہسپتال سے آیا تھا اور اس میں لکھا تھا:

"ہم بڑے دُکھ سے آپ کو اطلاع دیتے ہیں کہ ۲ نومبر ۱۸۹۴ء کو تین بجے دوپہر آپ کی بیوی ایک حسین اور صحتمند بچّی کو جنم دینے کے بعد دنیائے فانی سے رُخصت ہو گئی۔"

تب مجھے یاد آیا کہ یہ وہی تاریخ اور وہی وقت تھا جب ہم ہَرم کے اندر شہزادی تارا کی ممی کے پاس کھڑے تھے۔

"آہ —— میری بچّی ——" مسٹر ٹریلانی کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ "مجھے فوراً اس کی خبر لینا چاہیے۔ غضب خدا کا آج گیارہ تاریخ ہو گئی۔ گویا حادثہ ہوئے آٹھ روز بیت چکے —— جلدی کرو میرے دوست کاربیک، اورینٹ ایکسپریس میں ایک نشست کا فوری انتظام تمہارے سپرد ہے۔ مَیں اسی وقت اسکندریہ جانا چاہتا ہوں۔"

"ایک نشست؟" مَیں نے حیرت سے پوچھا۔ "کیا مَیں قاہرہ ہی میں آپ کی واپسی کا انتظار کروں؟"

"نہیں۔ نہیں۔ تم ممی اور دوسرا سامان لے کر لندن چلے جاؤ۔ ایک لمحے کی تاخیر نہ کرو۔ یہ سب چیزیں میرے مکان کے اُس کمرے میں قرینے سے رکھ دینا جہاں میں سوتا ہوں۔ سمجھ گئے؟ اور کسی کو مت بتانا کہ یہ ممی کس کی ہے اور تم اسے کہاں سے لائے ہو۔ مَیں تمہارے پیچھے پیچھے بچّی کو اسکندریہ سے لے کر لندن پہنچتا ہوں۔"

مسٹر ٹریلانی اُسی روز اسکندریہ روانہ ہو گئے اور مَیں مارسیلز کے راستے لندن چلا آیا۔ کوئی پندرہ روز بعد مسٹر ٹریلانی اپنی نوزائیدہ بچّی کے ساتھ نمودار ہوئے اور مَیں اُنہیں دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ اُن کے چمکیلے سیاہ بال برف کی مانند سفید ہو چکے تھے اور وہ چہرہ جو کبھی بے شکن تھا، اب بے شمار جھرّیوں کو چھپانے میں ناکام ہو رہا تھا۔ اُن کی آنکھیں بے نور اور اندر کو دھنسی ہوئی تھیں اور وہ پہلے سے بے حد کمزور اور نحیف دکھائی دے رہے تھے۔ اُس دن کے بعد سے آج تک مَیں نے

مسٹر ٹریلانی کے لبوں پر وہ مسکراہٹ دوبارہ نہیں دیکھی جس میں زندگی تھی، زندہ رہنے کی آرزو تھی اور جسے دیکھ کر میں اپنے اندر عزم و ہمت کی ایک نئی رَو دوڑتی ہوئی محسوس کرتا تھا۔"

"معاف کرنا میرے عزیز، میں کچھ جذباتی سا ہو گیا۔" اس نے کہا۔ "دراصل ہم سائنس دانوں اور محقق قسم کے لوگوں کو جذبات سے الگ ہٹ کر سوچنا چاہیے، مگر افسوس اس مرحلے میں آن کر قطعی ناکام ثابت ہوئے ہیں۔ بہرحال —— معلوم ہوا کہ بچی کی پیدائش اپنی ماں کے مرنے کے بعد ہوئی تھی۔ مسٹر ٹریلانی کے دل میں اس شک و شبہے نے جڑیں پکڑ لی تھیں کہ اس سانحے کا کچھ تعلق یعنی بیوی کی موت کا، شہزادی تارا سے ضرور ہے۔ قصہ مختصر انہوں نے عارضی طور پر اپنی بچی کو ایک ہوشیار نرس کی تحویل میں دے دیا جو اسے بالکل اپنی بچی کی طرح چاہنے لگی تھی۔ اس دوران میں ایک عجیب بات یہ ہوئی کہ مسٹر ٹریلانی نے ایک بار بھی مجھے بچی کو دیکھنے نہ دیا۔ میں دل میں سخت حیران تھا کہ آخر یہ کیا اسرار ہے! تاہم اُن کا پرانا مزاج شناس ہونے کے باعث میں خاموش رہا اور سمجھ گیا کہ اس کی تہ میں بھی کوئی راز پوشیدہ ہے جو خود بخود کسی روز کھل جائے گا۔

اس دوران میں ہم دونوں مل کر دلچسپیوں پر گھنٹوں گفتگو کرتے، ایک ساتھ کھانا کھاتے، اکٹھے سیر کرتے، کبھی کبھی لندن میوزیم میں بھی چلے جاتے، مگر وہاں زیادہ دل نہ لگتا۔ بے وقوف قسم کے پڑھے لکھے جاہل ہمیں گھیر لیتے اور فضول قسم کے سوالات کر کے ناطقہ بند کر دیتے۔ اس تمام مدت میں جو غالباً ایک ڈیڑھ سال کی ہو گی، میں نے مسٹر ٹریلانی کی بچی کو ایک بار بھی نہیں دیکھا۔ ہر وقت وہ ایسی گورنس کی حفاظت میں رہتی تھی جسے محاورے کے مطابق سات تالوں میں بند کر کے رکھا گیا تھا! تاہم گھر کے دوسرے نوکروں سے میں اس بچی کے بارے میں باتیں سُنتا رہتا تھا۔ وہ سبھی اس سے بے پناہ پیار کرتے اور اس کی خوبصورتی اور ذہانت کی تعریف میں رطب اللسان رہتے تھے۔

"مجھے اچھی طرح یاد ہے، اُس روز موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ سارا دن، ایک لمحے کے لیے بھی، مجھے اور مسٹر ٹریلانی کو مکان سے باہر قدم رکھنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ سہ پہر کی چائے پینے کے بعد انہوں نے مجھے اپنے سٹڈی رُوم میں آنے کا اشارہ کیا۔ اس زمانے میں شہزادی تارا کا تابوت اور اس کے مقبرے سے لائی گئی تمام چیزیں انہوں نے سٹڈی روم میں رکھی تھیں۔ شہزادی کے تابوت میں سے سیاہ بلی کی ایک حنوط کی گئی لاش بھی ملی تھی۔ یہ شہزادی کی پالتو بلی تھی اور شہزادی کی ہدایت کے مطابق اسے بھی حنوط کر کے مقبرے میں رکھا گیا تھا تاکہ بلی کی رُوح بھی اپنی مالکہ کی رُوح کے ساتھ ساتھ رہے۔ سات ستاروں والا یاقوت مسٹر ٹریلانی نے اسی بلی کے پیٹ میں رکھ دیا تھا تاکہ چوری ہونے کا خدشہ باقی نہ رہے۔

مسٹر ٹریلانی کے چہرے پر پھیلی ہوئی بے پناہ سنجیدگی سے میں نے یہ تاثر لیا کہ وہ کوئی اہم بات مجھ سے کہنا چاہتے ہیں، چنانچہ میں ہمہ تن گوش ہو گیا۔ اُن کے سٹڈی روم کی تمام کھڑکیاں بند تھیں اور ان پر گہرے سُرخ رنگ کے ریشمی پردے پڑے تھے۔ کمرے کے بالکل وسط میں نہایت طاقت ور برقی قمقمہ روشن تھا۔ اس کی روشنی اتنی تیز تھی کہ میری آنکھیں چوندھیا گئیں۔ یہ ایک عجیب واقعہ تھا۔ مسٹر ٹریلانی ہمیشہ سے مدھم سبز روشنی میں کام کرنے کے عادی تھے اور تیز روشنی انہیں ناگوار تھی، مگر اب . . . بہرحال چند لمحوں بعد یہ بھید بھی کھل گیا۔

"آؤ، تمہیں ایک عجیب چیز دکھاؤں۔" مسٹر ٹریلانی نے کہا اور مجھے کمرے کے مشرقی گوشے میں لے گئے جہاں شہزادی تارا کے تابوت سے نکالا گیا وہ پُراسرار ڈبا رکھا تھا جسے کسی نامعلوم عنصر سے بنایا گیا تھا۔ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ اس ڈبے کے اُوپر بے شمار باریک لکیریں اور تصویریں نقش تھیں، مگر اب تیز برقی روشنی میں اس ڈبے کو دیکھ کر میرے بدن میں تھرتھری سی چھوٹ گئی۔ یقین کیجیے یہ لکیریں، جن کا رنگ آہستہ آہستہ سُرخ ہوتا جا رہا تھا، متحرک نظر آتی تھیں۔

یوں محسوس ہوتا تھا جیسے صاف و شفاف رگوں میں خون گردش کر رہا ہو۔

"خدا کی پناہ ——" میرے منہ سے بے اختیار یہی الفاظ برآمد ہوئے۔

"یہ نہایت عجیب طلسم ہے۔"

"ہاں —— تم نے ٹھیک کہا ——" مسٹر ٹریلانی نے گردن کو جنبش دے کر کہا۔ اُن کی آواز میں دبی ہوئی بے انداز مسرت کا احساس ہوتا تھا۔ جب سے یہ پُراسرار ڈبا تابوت میں سے برآمد ہوا ہے، میں برابر اس فکر میں تھا کہ آخر اس کا مطلب کیا ہے۔ ظاہر ہے یہ ڈبا کسی مخصوص صفت کا حامل ہوگا، تبھی شہزادی تارا نے اسے اپنے تابوت میں رکھوایا تھا۔ کئی دن تک میں اس معمے پر غور کرتا رہا، مگر کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ آخر ایک رات، جبکہ تم اپنے کمرے میں آرام کی نیند سو رہے تھے، یہ راز مجھ پر کُھل گیا۔ میں باہر لان میں ٹہل رہا تھا۔ اُس روز اتفاق سے مطلع صاف تھا اور آسمان پر نور کی قندیلیں روشن تھیں۔ پھر میں نے اُن سات ستاروں کو دیکھا جنہیں ماہرین فلکیات "دبِ اکبر" کہتے ہیں۔ یہ ساتوں ستارے اُس شب غیر معمولی طور پر چمک رہے تھے اور میں نے دیکھا کہ ان سے نکلتی ہوئی روشنی کی کرنیں میرے مکان کی جانب آ رہی ہیں، عین اُس جگہ پر جہاں شہزادی تارا کا تابوت رکھا ہے۔ پہلے تو میں نے اسے اپنی نظر کا فریب خیال کیا، مگر تھوڑی دیر بعد گھر کی ایک خادمہ نے اس کی تصدیق کر دی تو یک لخت سارا راز عیاں ہو کر سامنے آ گیا۔ مجھے یاد آیا کہ شہزادی تارا کے مقبرے کی دیواروں پر بھی جا بجا ان سات ستاروں کے نقش کُھدے ہوئے تھے، پھر سُرخ یاقوت کے سات ستارے . . . . اس کے بعد ڈبے پر بنے ہوئے ستاروں کے نشان —— یقیناً اِن کا آپس میں گہرا تعلق ہے . . . میں جلدی سے اسی کمرے میں آیا اور یاقوت کو نکال کر اپنی ہتھیلی پہ اس طرح رکھا کہ آسمان کے ستاروں کی روشنی اس پر پُوری طرح پڑنے لگی . . . . اور چند لمحے بعد ہی میں نے محسوس کیا کہ یاقوت میں جیسے زندگی کی لہر دوڑ رہی ہے۔ وہ گرم ہونے لگا

اور اس پر نقش ساتوں ستاروں میں سے بھی تیز شعاعیں پھوٹنے لگیں۔ آہستہ آہستہ یہ یاقوت اتنا گرم اور سُرخ ہو گیا کہ میری ہتھیلی کی جلد اس کی شدید حدت کی تاب نہ لا سکی اور میں نے فوراً اسے کوٹ کی جیب میں ڈال لیا۔"

"بہت خوب . . . بہت خوب . . . اس دریافت پر میں دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں۔"

مسٹر ٹریلانی نے گرم جوشی سے میرا ہاتھ دبایا اور کہنے لگے:

"میرے دوست، یہ سب تمہاری محنت اور کوششوں کے نتائج ہیں۔ اسلیے تم بھی اس خوشی میں برابر کے شریک ہو۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ سات ستاروں کے اثرات کیا ہیں —— یاقوت جیب میں ڈالنے کے بعد میں اُس ڈبے کو گھسیٹ کر روشنی میں لایا اور جیسا کہ اُمید تھی، اس ڈبے پر بنے ہوئے ستاروں میں بھی جان پڑنے لگی اور یہ پتلی پتلی لکیریں آہستہ آہستہ سُرخ ہو کر حرکت کرنے لگیں۔ جیسا کہ تم اس وقت دیکھ سکتے ہو —— قِصّہ مختصر میں دیر تک یہ تماشا دیکھتا رہا اور حیران ہوتا رہا۔ اس کے بعد آسمان ابر آلود ہو گیا اور دبِ اکبر نظر سے اوجھل ہو گئے۔ چنانچہ اس ڈبے کی لکیریں بھی مدھم پڑتی گئیں اور چند لمحوں بعد یہ روشنی بالکل غائب ہو گئی۔

"یہ پُراسرار روشنی تو غائب ہو گئی، مگر میرے دماغ کے چودہ طبق روشن کر گئی۔ مجھے یکایک خیال آیا کہ شہزادی تارا نے اپنے مقبرے میں ضرور ایسا بندوبست کیا ہوگا جس کے ذریعے اس یاقوت تک روشنی پہنچ سکے یا اس ڈبے کو روشن کیا جا سکے —— چنانچہ میں نے وہ تمام کاغذات اور نقشے نکالے جن پر مقبرے کی دیواروں، ستونوں، فرش اور چھت کے تمام نقوش نقل کیے گئے تھے۔ ان تحریروں سے انکشاف ہوا کہ سات ستونوں میں سے کسی ایک میں تین چراغ رکھے گئے ہیں جن کی روشنی اس یاقوت اور ڈبے پر پڑتی تھی —— مگر تمہیں یاد ہوگا کہ ہم نے مقبرے کی ایک ایک اِنچ جگہ اچھی طرح دیکھی بھالی تھی اور وہاں ان چراغوں کا کوئی نام و نشان نہ تھا ——"

"بے شک ——— لیکن سوال یہ ہے کہ وہ چراغ گئے کہاں ؟" میں نے پوچھا۔

"ممکن ہے اب بھی وہیں ہوں ——— شاید کسی خفیہ ڈراڑ یا خانے میں رکھے ہوں ——— ان کی تلاش اب بے حد ضروری ہو گئی ہے۔ ذرا ٹھہرو، میں تمہیں دکھاتا ہُوں۔"

یہ کہہ کر مسٹر ٹریلانی نے نقشوں کا ایک اور پلندہ نِکالا اور ان میں سے ایک نقشہ نکال کر میرے سامنے پھیلا دیا۔ اس میں شہزادی تارا کے مقبرے کا اندرونی حِصّہ دِکھلایا گیا تھا۔

یہ بات تو طے شدہ ہے کہ شہزادی تارا کا مقبرہ، اپنے طرزِ تعمیر کے اعتبار سے، اُن تمام مقبروں سے بالکل جُدا ہے جو دوسرے فِرعونوں نے اپنے لیے تعمیر کروائے تھے۔ اس کا ایک اہم اور خاص مقصد تھا۔ مجھے جو چیز شہزادی تارا کے مقبرے میں سب سے نمایاں نظر آتی ہے، وہ یہ ہفت پہلو ہفت ستون ہیں جو مقبرے کی چھت کو اُٹھائے ہوئے ہیں۔ فرعونوں کے دوسرے مقبروں اور اہرام میں بھی ایسے ستون بے شک بنے ہوئے ہیں، لیکن بالکل گول ہیں ——— اِن ستونوں کی ترتیب بھی دبِ اکبر کی طرح ہے ——— اب اِس درمیانی ستون پر نقش کی ہوئی اِس تصویر کو بغور دیکھو ——— صاف پتہ چل جائے گا کہ نین خاص چراغ اِس ستون کے اندر رکھے گئے ہیں جنہیں شہزادی تارا نے اپنی زندگی ہی میں تیار کرایا تھا، اپنی رُوح کی حفاظت کے لیے۔ پھر فان ہر[illegible]ن کے سفرنامے میں بھی اِن کا ذکر موجود ہے۔ وہ مقبرے کے حالات میں لکھتا ہے کہ یہاں نہایت خوشبودار روغن بڑی مقدار میں بکھرا ہوا تھا اور ایسے کئی بڑے بڑے برتن بھی وہاں رکھے تھے جن میں کبھی تیل اُوپر تک بھرا تھا، مگر اب وہ تقریباً خالی ہو چکے تھے ——— تاہم ان کی تہ میں تیل کی معمولی مقدار اب بھی موجود ہے ——— تمہیں یاد ہو گا کہ مَیں نے ایک برتن میں سے تھوڑا سا یہ تیل نکال کر شیشی میں بھر لیا تھا۔ مَیں نے اِس تیل کا تجزیہ کر کے معلوم کیا کہ اسے کس طرح تیار کیا گیا ہے ؛ اب صرف چراغوں کی کمی ہے اور وہ چراغ تم ہی

لا سکتے ہو۔"

"کیا مطلب ؟" مَیں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"مطلب یہ کہ تم دوبارہ شہزادی تارا کے مقبرے میں جاؤ اور چراغ تلاش کرو۔ اگر وہاں نہ ملیں تو کہیں اور ڈھونڈو ——— اور اُس وقت تک میرے پاس نہ آنا جب تک چراغ حاصل نہ کر لو۔"

مَیں خاموش رہا۔ پھر ہم دونوں سٹڈی رُوم سے باہر آ گئے۔

اگلے روز صُبح مَیں نے سفر کی تیاری شروع کی اور جب مسٹر ٹریلانی سے رُخصت ہونے گیا تو اُنہوں نے مجھے گلے سے لگا لیا۔ ہم دونوں کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد وہ بولے :

"کیا جانے سے پہلے بچّی کو گود میں لے کر پیار نہ کرو گے ؟"

اُن کے مُنہ سے نِکلا ہوا یہ جُملہ میرے لیے ایسا غیر متوقع اور اِتنا حیران کُن تھا کہ میں اُن کی طرف تکتا رہ گیا۔

"آہ، تمہیں اِس بات پر حیرت ہُوئی۔" انہوں نے کہا۔ "لیکن اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں۔ میں نے ایک خاص مقصد کے تحت اِس بچّی کا چہرہ تمہاری نگاہوں سے چھپائے رکھا ہے۔ اب چونکہ تم ایک طویل سفر پر روانہ ہو رہے ہو، اور ممکن ہے یہ ہماری آخری ملاقات ہو، اِس لیے میں چاہتا ہوں کہ تمہیں بچّی کا چہرہ دِکھا دوں۔"

اُنہوں نے گھنٹی بجائی۔ چند لمحوں بعد دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی اور ایک خادمہ بچّی کو شال میں لپیٹے کمرے میں آئی۔ اُس نے بچّی کو مسٹر ٹریلانی کی گود میں دیا اور چُپ چاپ باہر نکل گئی۔ تھوڑی دیر تک کمرے میں گہری خاموشی چھائی رہی۔ مسٹر ٹریلانی ڈبڈبائی نظروں سے بچّی کو دیکھ رہے تھے۔ دفعتہً وہ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ میری طرف آئے اور ڈرامائی انداز میں بولے :

"کاربیک، دیکھو . . . اس کا چہرہ بغور دیکھو . . . تمہیں محسوس ہو گا کہ تُم نے یہ چہرہ پہلے بھی دیکھا ہے . . . یاد کرو . . . کہاں . . . کس جگہ . . . ."

پروفیسر کاربیک نے جیب سے رومال نکال کر پیشانی پر نمودار ہونے والے پسینے کے قطرے پونچھے۔ شدّتِ جذبات سے ان کی حالت عجیب تھی۔ کہنے لگے:

"میرے عزیز مالکم روز، وہ لمحہ جب مَیں نے ننھی ٹریلانی پر نظر ڈالی، کبھی فراموش نہ کرسکوں گا۔ فرطِ حیرت سے میرا بدن گویا پتھر کا ہوگیا تھا۔ میری نظروں کے سامنے شہزادی تارا کا حسین چہرہ گھوم رہا تھا۔ خدائے لایزال کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اُس میں اور ننھی منّی مس ٹریلانی کے چہرے میں بال برابر کا بھی فرق نہ تھا۔ وہی آنکھیں، وہی ہونٹ، وہی ناک، وہی ملکوتی تبسم —— یکایک مسٹر ٹریلانی نے اس کا دایاں بازو کہنی تک برہنہ کردیا اور اِس مرتبہ مَیں اپنی چیخ نہ روک سکا۔ کہنی کے قریب سُرخ رنگ کا دائرہ سا بنا ہُوا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس میں سے خون کے قطرے بس ٹپکنے ہی والے ہیں ——"

میرے ذہن میں پروفیسر کاربیک کی یہ داستان سُن کر ایک انوکھا سوال پیدا ہو رہا تھا اور اِس سے پیشتر کہ مَیں یہ سوال اُن سے کروں، دروازہ آہستہ سے کھُلا اور مس ٹریلانی کی شیریں آواز کانوں میں رس گھولنے لگی:

"ارے چچا کاربیک اور مسٹر مالکم روز، آپ یہاں بیٹھے ہیں۔ مَیں سمجھی آپ کہیں باہر چلے گئے ہیں۔"

یہ پہلا اتفاق تھا کہ مَیں نے اس کے معصوم اور روشن چہرے پر نگاہ نہیں ڈالی، بلکہ غور سے اس کے دائیں ہاتھ کو تکنے لگا اور پھر میرے جسم کے رونگٹے کھڑے ہونے لگے۔ مجھے اُس سوال کا جواب مل گیا تھا جو میں پروفیسر کاربیک سے پوچھنا چاہتا تھا۔

مس ٹریلانی کے دائیں ہاتھ میں پانچ کے بجائے سات اُنگلیاں تھیں۔

ڈبا کھُلتا ہے

مس ٹریلانی کے یک لخت کمرے میں آنے کے بعد میری جو کیفیت ہوئی، اُسے کن الفاظ میں بیان کروں؟ اتنا یاد ہے کہ جسم کا تمام خون سمٹ کر کلیجے میں آ گیا تھا۔ میرے سامنے شہزادی تارا جیتی جاگتی، اپنے بے مثال حسن وجمال، عظیم شان وشکوہ اور وقار کے ساتھ کھڑی مُسکرا رہی تھی۔ میرا سر چکرانے لگا اور آنکھوں کے سامنے شرارے سے اڑنے لگے۔ اِتنا یاد ہے میرے حلق سے ایک گھُٹی گھُٹی سی چیخ نکلی تھی، پھر مجھے دنیا ومافیہا کی خبر نہ رہی۔

خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ میں کتنی دیر بے ہوش رہا۔ آنکھ کھُلی تو ڈاکٹر ونچسٹر کا شفیق اور مانوس چہرہ مجھ پر جھکا ہوا تھا۔ برابر ہی میں پروفیسر کاربیک کھڑا اپنی چُندھی چُندھی، لیکن مضطرب آنکھوں سے مجھے گھور رہا تھا۔ اُس نے میری حالت سنبھلتے دیکھی تو ایک لمحے کے لیے چہرے کا رنگ تبدیل ہُوا اور اُس نے کہا:

"خدا کا شکر ہے تم ہوش میں تو آئے۔ مَیں نہیں سمجھتا تھا تمہارے اعصاب اس قدر کمزور ہوں گے۔"

"براہِ کرم باتیں نہ کیجیے، انہیں آرام کی ضرورت ہے۔" ڈاکٹر ونچسٹر نے کہا

اور ہونٹوں پر اُنگلی رکھ کر کاربیک کو خاموش رہنے کا اشارہ بھی کیا۔

"میں ٹھیک ہوں ڈاکٹر .... مگر ... مجھے ہوا کیا تھا؟" مَیں نے پوچھا
جواب میں ڈاکٹر نے قریبی میز پر رکھی ہوئی ایک شیشی اُٹھائی، پانی کے گلاس میں دوا کے چند قطرے ٹپکائے اور گلاس میری طرف بڑھا دیا:

"اسے پی جایئے مسٹر مالکم روز، آپ ڈر کر بے ہوش ہو گئے تھے۔"

"ڈر کر؟" مَیں چلّایا۔ "یہ غلط ہے — مَیں بھلا کیونکر ڈر سکتا ہوں؟"

اِتنے میں دروازہ کھُلا اور مسٹر ٹریلانی مسز گرانٹ کی معیت میں کمرے میں داخل ہوئے۔ اُن کے لبوں پر پُراسرار مسکراہٹ تھی۔ میرے پلنگ کے قریب آ کر محبّت و شفقت سے اپنا ہاتھ میری پیشانی پر رکھا اور ڈاکٹر ونچسٹر سے مخاطب ہو کر کہا:

"ڈاکٹر، مَیں چاہتا ہوں کہ اس نوجوان کو کوئی تکلیف نہ ہو، مجھے اس سے بڑی توقعات ہیں۔"

اُن کے مُنہ سے نکلا ہوا یہ جُملہ وہ کام کر گیا جو ڈاکٹر ونچسٹر کی ساری دوائیں بھی نہ کر سکتی تھیں۔ مَیں نے اپنے دل میں مسرّت کی دھڑکنیں محسوس کیں۔

"اب تمہاری طبیعت کیسی ہے بیٹے؟" مسٹر ٹریلانی نے پُوچھا۔ "تھوڑی دیر پیشتر لڑکی نے بتایا کہ تم اور کاربیک بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ اچانک تم چیخ مار کر بے ہوش ہو گئے۔ آخر بات کیا تھی؟"

"کچھ نہیں جناب، کوئی خاص بات نہ تھی۔" مَیں نے ہکلاتے ہوئے جواب دیا۔

"میرا خیال ہے حضرات، مسٹر مالکم رُوز کو آرام کرنے دیا جائے۔" ڈاکٹر ونچسٹر نے اِس صورتِ حال سے پریشان ہوتے ہوئے کہا۔ "مَیں درخواست کرتا ہوں کہ سب لوگ اپنے اپنے کمروں میں چلے جائیں۔ مریض کو بالکل تنہا چھوڑ دیا جائے۔ مَیں ابھی تک اِن کی نبض سے مطمئن نہیں ہُوں۔"

چند لمحے بعد کمرہ خالی ہو گیا۔ اب مَیں نے سوچنا شروع کیا آخر میں بے ہوش کیونکر ہوا۔ کاربیک کی گفتگو آہستہ آہستہ یاد آنے لگی اور پھر سات اُنگلیوں والا ہاتھ .... اُف میرے خدا، کیا مس ٹریلانی کے دائیں ہاتھ کی اُنگلیاں سات ہیں .... لیکن اس سے پہلے تو مَیں نے ایسا نہیں دیکھا.... ممکن ہے میرا دھیان اِس طرف نہ گیا ہو.... آہ.... اگر یہ حقیقت ہے تو کیا.... کیا ملکہ تارا مس ٹریلانی کی صُورت میں دوبارہ اس دنیا میں آ گئی ہے؟ .... خدایا، یہ کیا اسرار ہے؟ مَیں پاگل ہو جاؤں گا.... ایک پھر کمرے کے در و دیوار گھومنے لگے، مَیں نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا اور سسکیاں بھرنے لگا۔

کئی دن گزر گئے۔ اس دوران میں گھر کے ہر فرد نے خدمت میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ مسٹر ٹریلانی کا یہ حال تھا کہ دن میں کئی کئی مرتبہ مجھے آ کر دیکھتے اور اطمینان کا اظہار کرتے، مگر مس ٹریلانی کا حسین چہرہ مجھے دکھائی نہ دیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُسے میرے کمرے میں آنے کی اجازت نہیں دی جا رہی۔ یہ سوچ کر مجھے سخت رنج ہُوا، لیکن مَیں نے اس کا ذکر کرنا مناسب نہ سمجھا۔ مسٹر کاربیک کو مَیں نے کئی بار پریشانی کے عالم میں کچھ سوچتے اور غور و فکر کرتے پایا اور اکثر ایسا ہُوا وہ کوئی بات کرنے کے ارادے سے میرے قریب آئے، مگر دوسرے ہی لمحے مسز گرانٹ، ڈاکٹر ونچسٹر یا کوئی ملازم اس کمرے میں آ جاتے اور مسٹر کاربیک دانت پیستے ہوئے باہر چلے جاتے۔

دسویں روز، جبکہ مَیں باغیچے میں چہل قدمی کرتے ہوئے اس امر پر غور کر رہا تھا کہ مس ٹریلانی کی مُجھ سے "پردہ" کرنے کی وجہ کیا ہو سکتی ہے، پروفیسر کاربیک دبے پاؤں نمودار ہوا اور میرا ہاتھ پکڑ کر درختوں کے جُھنڈ میں لے گیا۔ وہاں دو آرام کرسیاں پہلے ہی سے پڑی تھیں۔

"میرے عزیز، تم نے اُس روز بے ہوش ہو کر سارا نظام درہم برہم کر دیا۔"

وہ اپنا غصّہ دبا نہ سکا۔ "بندۂ خدا، آخر تم کیا دیکھ کر بیہوش ہوئے تھے؟"

"آپ کو معلوم نہیں؟" مَیں نے حیرت سے کہا۔ "میرا خیال ہے آپ نے خود اس چیز کا مشاہدہ کیا تھا۔"

"خُدا کے لیے جلد بتاؤ، وہ کیا چیز تھی؟"

"مَیں نے مس ٹریلانی کے دائیں ہاتھ میں پانچ کے بجائے سات اُنگلیاں دیکھیں۔"

کاربیک پر اس جملے کا کوئی اثر نہ ہُوا۔ اسی طرح خاموش بیٹھا میری جانب تکتا رہا۔ اُس نے رومال نکالا، اپنے پھُولے ہوئے چہرے سے پسینہ پونچھا، پھر کہنے لگا:

"تمہیں وہم ہُوا ہے میرے عزیز، مس ٹریلانی کے دونوں ہاتھوں میں پانچ پانچ اُنگلیاں ہیں۔"

"مگر.... مگر مَیں نے اپنی آنکھوں سے سات اُنگلیاں دیکھی ہیں اور اسی باعث میں دہشت سے بے ہوش ہُوا۔" مَیں نے جرح کی۔

"اُف خُدایا، مَیں اپنا سر دیوار سے ٹکرا دوں گا۔" کاربیک نے جھلّا کر کہا۔ "فضول بحث کیے جاتے ہو، مَیں بار بار کہتا ہُوں یہ تمہارا وہم ہے۔ اگر کہو تو ابھی مس ٹریلانی کو بُلوا کر دونوں ہاتھوں کا معاینہ کرا دوں؟"

"بُلوائیے۔"

وہ اُٹھ کر ایک طرف چلا گیا۔ مَیں نے کھُسر پھُسر کی آوازیں سُنیں اور چند لمحے بعد مس ٹریلانی ہزار رعنائیوں اور دلفریبیوں کے جلَو میں میرے سامنے کھڑی مسکرا رہی تھیں۔ وہی شہزادی تارا کے یاقوتی ہونٹ اور ان ہونٹوں پر بکھرا ہوا سدابہار تبسّم —— پروفیسر کاربیک نے انتہائی بدتمیزی سے مس ٹریلانی کے دونوں ہاتھ پکڑ کر میرے سامنے کر دیے۔

"لو خود دیکھ لو، کہاں ہیں سات اُنگلیاں ——"

مجھے سخت ندامت ہو رہی تھی۔ یہ لڑکی میرے بارے میں نہ جانے کیا سوچتی

ہو گی کہ مَیں کیسا بُزدل اور بے وقوف شخص ہُوں۔ مَیں نے غور سے اس کے ہاتھوں کو دیکھا۔ دونوں میں پانچ پانچ اُنگلیاں تھیں۔ نرم، نازک، لمبی اور سفید اُنگلیاں —— جیسے سنگِ مرمر سے تراشی گئی ہوں.... البتّہ اُس کی کہنی کے پاس اب بھی سُرخ رنگ کا باریک سا دائرہ موجود تھا جس پر خون کی لکیر اُبھری اُبھری سی نظر آ رہی تھی۔

"مَیں آواگون کا قائل نہیں مسٹر مالکم رُوز۔" کاربیک نے کہا۔ "لیکن ہے یہ دلچسپ بات کہ مس ٹریلانی کی شکل صُورت اور قد و قامت شہزادی تارا سے حیرت انگیز مشابہت رکھتی ہے۔"

"صاحب، میرا دماغ واقعی جواب دینے لگا ہے یہ باتیں دیکھ دیکھ کر۔" مَیں نے کہا۔ "مس ٹریلانی، آپ کا کیا خیال ہے؟"

"یہ سب ڈیڈی کے شعبدے ہیں۔" اُس نے ہنس کر جواب دیا اور اُسکے موتی جیسے دانتوں سے روشنی کی کرنیں خارج ہونے لگیں۔

"شعبدے؟" کاربیک چلّایا۔ "بخُدا بالکل صحیح کہا۔ مَیں نہیں جانتا تھا کہ اس سولہ سترہ برس کے وقفے میں مسٹر ٹریلانی کہاں سے کہاں پہنچ جائیں گے۔ بہرحال مَیں اَب جلد سے جلد یہاں سے رُخصت ہو جانا چاہتا ہُوں مجھے دُنیا کے اور بہت سے کام کرنے ہیں۔"

"میری اجازت کے بغیر تم ہرگز نہیں جا سکتے کاربیک۔" ایک جانب سے مسٹر ٹریلانی کی بارعب آواز آئی، لیکن اِس آواز میں دھمکی کے بجائے محبّت کا عنصر غالب تھا۔ "اصل کام تو اب شروع ہوا ہے۔ آؤ، مَیں تم لوگوں کو ایک چھوٹا سا شعبدہ دِکھاؤں۔"

"خُدا رحم کرے —— آپ کب سے یہاں چھُپے ہوئے ہیں؟" کاربیک نے پوچھا

"مَیں ابھی ابھی آیا تھا اور اتفاق سے مَیں نے تم لوگوں کی تمام باتیں سُن لی ہیں۔ اَب مَیں ان حالات کو مزید راز میں رکھنا نہیں چاہتا اور جہاں تک

میں خود علم حاصل کر چکا ہوں، وہ تم لوگوں پر ظاہر کر دینے کا خواہش مند ہوں۔ کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے میری زندگی کے دن تھوڑے رہ گئے ہیں اور میں اپنی پیاری بیٹی کے پاس زیادہ عرصے تک نہ رہوں گا۔"

"ڈیڈی، یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟" مس ٹریلانی نے رنجیدہ لہجے میں کہا۔ "آپ مذاق تو نہیں کر رہے؟"

"کاش! یہ مذاق ہوتا۔" مسٹر ٹریلانی نے ٹھنڈا سانس بھر کر کہا۔ "اب سوچتا ہوں تو افسوس ہوتا ہے کہ ساری زندگی ایک بے کار اور لاحاصل مشغلے میں کاٹ دی۔ عمر کے سولہ سال بہت قیمتی ہوتے ہیں، لیکن میں نے یہ سولہ سال شہزادی تارا کی ممی کی تلاش، اُسے یہاں لاتے اور اُس پر ریسرچ کرنے میں ضائع کر دیے اور نتیجہ کیا برآمد ہوا؟ یہی کہ میں ذہنی سکون سے ناآشنا ہو چکا ہوں اور طلسم کے ایسے گورکھ دھندے میں پھنس گیا ہوں کہ اس سے نکلنا میرے بس میں نہیں رہا۔ ہاں، اس کا علاج موت ہے، صرف موت——"

مس ٹریلانی اپنے باپ سے چمٹ کر رونے لگی۔ یہ منظر انتہائی المناک تھا۔ پروفیسر کاربیک بھی رُومال سے اپنے آنسو پونچھ رہا تھا۔ بالآخر اُس نے دبے لہجے میں مسٹر ٹریلانی سے کہا:

"آپ کوئی شعبدہ دِکھانے کو کہتے تھے؟"

"ہاں، یاد آیا—— آؤ تم سب میرے کمرے میں آجاؤ۔"

مدّت بعد ایک بار پھر مجھے اس کمرے میں جانے کا موقع ملا جہاں سے اس پُراسرار کہانی کا آغاز ہوا تھا۔ وہاں ہر شے اُسی طرح رکھی تھی جس طرح میں نے پہلے روز رکھے دیکھی تھی۔ مسٹر ٹریلانی نے کمرے کا دروازہ اچھی طرح بند کر کے کھڑکیوں پر پردے بھی کھینچ دیے اور ایک برقی قمقمہ روشن کر دیا۔ پھر انہوں نے پتھر کے بنے ہوئے اُس چھوٹے سے چوکور ڈبے کی طرف اشارہ کیا

جسے وہ اور مسٹر کاربیک شہزادی تارا کے حرم میں سے اُٹھا کر لائے تھے۔

"اِس ڈبّے کو پہچانتے ہو میرے دوست۔" انہوں نے پروفیسر سے پوچھا اور پروفیسر نے اثبات میں گردن ہلائی۔ مسٹر ٹریلانی نے تقریر کے سے انداز میں کہنا شروع کیا:

"یہ ڈبّا آپ لوگوں کو بادی النّظر میں پتھر کا دکھائی دیتا ہے، لیکن پتھر کا نہیں، کسی نامعلوم دھات کا ہے۔ یہ ڈبّا ہزاروں برس پیشتر آسمان سے زمین پر گرنے والے بہت بڑے شہابِ ثاقب سے کاٹ کر بنایا گیا ہے۔ تم دیکھتے ہو اس کا رنگ بھی سات تاروں والے یاقوت کی مانند سُرخ ہے اور اِس پر بھی یاقوت کی مانند سات تارے (دبِّ اکبر) بنے ہوئے ہیں۔ میں نے اسے کھولنے کی بہتیری کوشش کی، مگر یہ کسی طرح کھلتا نہ تھا۔ اتنا احساس ضرور تھا کہ اسے کسی خاص قاعدے اور اُصول کے تحت کھولا ضرور جا سکتا ہے۔ میں نے اسے مضبوط ہتھوڑوں کی مدد سے توڑنے کی سعی بھی کی، لیکن میرے تمام وزنی ہتھوڑے اِس پر ہلکا سا نشان لگانے میں بھی ناکام رہے ہیں—— اسے آگ میں بھی پگھلانا چاہا ہے، لیکن بے سُود۔ گھنٹوں دہکتی آگ میں پڑے رہنے کے باوجود اس ڈبّے کا کچھ نہیں بگڑا اور یہ ویسے کا ویسا ہی ہے۔ میں نے اس ڈبے کا راز جاننے کے لیے سولہ سال ضائع کیے ہیں اور ابھی چند دن پہلے تک قطعاً ناکام رہا تھا—— مگر اب—— اب میں بتا سکتا ہوں یہ کیا چیز ہے اور اس کی مدد سے اِنتہائی محیّر العقل شعبدہ دِکھا سکتا ہوں۔"

مسٹر ٹریلانی نے ایک وحشیانہ قہقہہ لگایا اور ڈبّے پر ہاتھ پھیرنے لگے۔ اُن پر جنون کی سی کیفیت طاری ہو رہی تھی اور اگر اُس لمحے پروفیسر کاربیک ہمارے ساتھ نہ ہوتا تو ہم لوگ ڈر کر بھاگ اُٹھتے یا بے ہوش ہو جاتے۔

"کیا مجھے اجازت ہے کہ اُسے ایک نظر غور سے دیکھوں؟" میں نے پوچھا

"ہاں—— ہاں، ضرور دیکھو—— اِس میں اجازت کی کیا بات ہے اسے

ہر شخص دیکھ سکتا ہے۔" ٹریلانی نے کہا۔ پروفیسر کاربیک نے مجھے اشارہ کیا اور خود بھی آگے بڑھا۔ سُرخ رنگ کی کسی نامعلوم اور بے حد سخت ہیرا نما دھات کا یہ ڈبا جس کی لمبائی تقریباً ڈیڑھ فٹ اور چوڑائی ایک فٹ سے ذرا کم ہوگی، نہایت چمکیلا اور چکنا محسوس ہُوا اور جب مَیں نے اس پر دیر تک انگلیاں جمائے رکھیں تو مجھے حِدّت کا احساس بھی ہونے لگا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا اس ڈبّے کے اندر آگ جل رہی ہے۔ اس کے اوپر اور دائیں بائیں بے شمار عجیب و غریب نقش و نگار کھُدے تھے، مگر ان میں سات ستاروں کے نقوش سب سے زیادہ نمایاں اور روشن تھے۔

"میری رائے میں یہ ڈبّا خود ایک بہت بڑا جوہر ہے جسے تراش خراش کر ڈبے کی صورت دے دی گئی ہے۔" کاربیک نے بڑبڑا کر کہا۔

"آہ ــــ میرے دوست ــــ تم پہچان گئے ــــ" مسٹر ٹریلانی نے جوشِ مسرّت سے چلّا کر کہا۔

"اِس میں کچھ زیادہ مہارت کی ضرورت نہیں جناب والا۔" کاربیک نے دوبارہ کہا۔ "اچھا، یہ تو بتائیے اس کے اندر سے روشنی کی جو کرنیں پھوٹ رہی ہیں، کیا یہ مستقل طور پر پھوٹتی رہتی ہیں یا ان میں کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔"

"بہت خوب... بہت خوب... تمہاری ذہانت کی داد دیتا ہوں دوست مجھے تم پر اور تمہاری رفاقت پر فخر ہے ــــ" مسٹر ٹریلانی نے تحسین آمیز نظروں سے کاربیک کو دیکھا۔ "میں سولہ سال میں جس نتیجے پر پہنچا، اُس نتیجے پر تم چند لمحوں میں پہنچ گئے۔ لو، اب وہ شعبدہ دیکھو اور قدیم مصریوں کی عقل و خرد کی داد دو کہ اس سائنس میں وہ ہم سے اب بھی صدیوں آگے ہیں۔"

یہ کہہ کر مسٹر ٹریلانی اُس میز کو گھسیٹ کر کمرے کے عین درمیان میں لائے جس پر یہ نادرِ روزگار ڈبّا رکھا تھا۔ پھر انہوں نے دائیں بائیں اور چھت میں لگے ہوئے سات برقی لیمپ یکے بعد دیگرے روشن کیے۔ یہ لیمپ اس انداز میں لگائے گئے تھے کہ اِن کی روشنی ٹھیک اُن سات ستاروں پر پڑ رہی تھی جو ڈبے کے اوپر

سطح پر بنے ہوئے تھے۔ لیمپ روشن ہوتے ہی میں نے دیکھا کہ ڈبے میں جیسے جان پڑنے لگی ہے۔ اس کا رنگ اگرچہ پہلے بھی سُرخ تھا، مگر اس میں جان نہ تھی اور اب وہ آہستہ آہستہ آگ کی مانند سُرخ ہوتا جا رہا تھا۔ پانچ منٹ کے اندر اندر وہ انگاروں کی مانند دہکنے لگا۔ اُس کے اندر اتنی چمک پیدا ہوگئی کہ اس پر آنکھ جمائے رکھنا ناممکن ہوگیا۔

"کوئی شخص اسے ہاتھ نہ لگائے ورنہ اس کا ہاتھ جل کر کوئلہ ہو جائے گا۔" مسٹر ٹریلانی نے خبردار کیا اور ہم سب دہشت سے دو دو قدم اور پیچھے ہٹ گئے۔ ڈبّا ہر لحظہ گرم ہو رہا تھا۔ پہلے وہ خونِ کبوتر کی مانند سُرخ ہُوا، پھر نارنجی، پھر نیلا اور آخر میں دودھ کی طرح سفید ــــ

"اب آپ اسے چھُو سکتے ہیں۔" مسٹر ٹریلانی کی آواز کسی گہرے کنوئیں میں سے آتی سنائی دی۔ مَیں نے اور کاربیک نے مشین کے پرزوں کی طرح تعمیل کی اور باری باری ڈبّے کو چھُو کر دیکھا۔ اب وہ برف کی مانند سرد تھا، مگر یہ حالت چند ثانیے ہی رہی۔ اس کے بعد ڈبّے کا رنگ دوبارہ بدلا، پھر آہستہ آہستہ اس کا ڈھکنا اُوپر اُٹھنے لگا اور وہ پُورا کھُل گیا۔ ہم نے دیکھا اس کے اندر سیاہ رنگ کی ایک چھوٹی سی بلّی جس کی آنکھیں زمرد کی مانند سبز تھیں، ہماری جانب گھور رہی ہے۔ وہ زندہ تھی اور مَیں اس کے سانس لینے کی آواز بخوبی سُن رہا تھا۔

ہم سب پتھر کے بے جان بُتوں کی مانند اپنی اپنی جگہ کھڑے تھے۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ ہزاروں سال پُرانے اس ڈبّے کے اندر، جو اس سختی سے بند تھا کہ ہوا بھی اس میں نہ جا سکتی تھی، یہ سیاہ بلّی کیونکر بند ہوئی اور بند ہونے کے ساتھ ساتھ اب تک زندہ بھی ہے۔

دفعتہً بلّی نے اپنے خوفناک سبز دیدے گھمائے اور مس ٹریلانی پر نظریں گاڑ دیں۔ مَیں نے دیکھا کہ بلّی کی حالت میں ایک عظیم تغیر رونما ہوا۔ وہ ہلکی آواز میں میاؤں میاؤں کرنے لگی، پھر ڈبّے سے اچھل کر باہر نکلی اور مس ٹریلانی کے

پیروں کی جانب بڑھی۔

"بیٹی ڈرنا مت —— یہ تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچائے گی۔ اپنا دایاں ہاتھ کہنی تک برہنہ کر لو ——" مسٹر ٹریلانی نے پکار کر کہا اور میں نے دیکھا کہ مس ٹریلانی نے، جن پر نشے کی سی کیفیت طاری تھی، اپنے بازو پر سے کپڑا ہٹایا اور کہنی برہنہ کر دی ——

سرخ دائرے میں سے خون کے چند قطرے ٹپکے جنہیں بلی نے جلدی سے چاٹ لیا اور دوبارہ ڈبے میں داخل ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی مسٹر ٹریلانی نے لیمپ بجھا دیے —— کمرے میں گھپ اندھیرا چھا گیا، مگر چند ثانیے بعد میں نے دیکھا ڈبا بدستور بند ہے اور اس کا رنگ تبدیل ہونے کے بعد پھر اپنی حالت پر آگیا ہے۔

"کیسا رہا یہ شعبدہ؟" مسٹر ٹریلانی نے کاربیک سے پوچھا۔

"بخدا! مجھے اب تک اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا کہ یہ سب کچھ میرے سامنے ہوا ہے۔" کاربیک نے کہا۔ "کہیں آپ لوگوں نے ہم کو ہپناٹائز تو نہیں کر دیا؟"

"آہا . . . . کیا بات کرتے ہو میرے دوست۔" ٹریلانی نے قہقہہ لگایا۔ "ہپناٹزم اس ہنر اور فن کے آگے گرد ہے جو تم نے ابھی دیکھا —— دراصل اس ڈبے کا راز مجھے بے حد غور و فکر کے بعد ملا ہے —— کچھ تو میں تمہیں پہلے ہی بتا چکا ہوں —— تین سوال میرے پیش نظر تھے جن کا جواب نہیں مل رہا تھا۔ ایک تو یہ کہ مجھے رات کی تاریکی میں زخمی کرنے والا کون تھا۔ دوسرے یہ کہ ڈبا کس چیز کا بنا ہوا ہے اور اس میں کیا ہے اور تیسرا یہ کہ اس پر سات ستارے کیوں بنے ہوئے ہیں اور یاقوت سے اس کا تعلق کیا ہو سکتا ہے۔ تین روز بیشتر ان سوالوں کا جواب بیک وقت مل گیا۔ رات کا وقت تھا۔ میں اسی کمرے میں ڈبے پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔ آسمان پر تارے چمک رہے تھے

اور انہی میں سات ستاروں کا وہ جمگھٹ بھی شامل تھا جس کی تصویر یاقوت اور ڈبے پر کھدی ہوئی ہے۔ ہر ستارہ خوب روشن تھا اور شمال کی جانب واقع، سب سے بڑا ستارہ تو اتنا چمکدار تھا کہ اس کی طرف نگاہ بھر کر دیکھنا دشوار ہو رہا تھا۔ یک لخت مجھے خیال آیا کہ ان ستاروں کا ڈبے سے کوئی نہ کوئی تعلق ضرور ہے۔ اپنے تجسس کو تسکین دینے کی خاطر میں نے یہ ڈبا اس تاریک گوشے میں سے نکال کر یہاں کھڑکی کے پاس اس انداز میں رکھا کہ اس پر سات ستاروں کا عکس پڑنے لگے۔ جونہی میں نے ڈبے کو کھلی جگہ میں رکھا، اس کے اوپر کندہ کیے گئے ستاروں میں سے روشنی کی کرنیں پھوٹ نکلیں اور پھر اس کا رنگ آہستہ آہستہ سرخ ہونے لگا، سرخ ہونے کے بعد نارنجی ہوا، پھر نیلا اور آخر میں سفید پڑ گیا۔ میں دم بخود ہو کر یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔ دفعتہً اس کا اوپری حصہ آپ ہی آپ کھل گیا اور پھر دہشت کی ایک نئی لہر میرے بدن میں دوڑ گئی۔

"ڈبے کے اندر چھوٹی سی سیاہ رنگ کی بلی بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھیں گہری سبز تھیں اور منہ بالکل سرخ —— پہلے میں یہ سمجھا کہ یہ بلی کی ممی ہے، لیکن دوسرے ہی لمحے اس بلی میں جان پڑ گئی۔ وہ خوفناک آواز میں غرائی اور اگر میں آگے بڑھ کر ڈبے کو تاریکی میں دھکیل نہ دیتا تو وہ اپنے مہلک اور لمبے پنجوں سے ضرور مجھ پر حملہ کر دیتی۔

"جونہی ڈبے کا ڈھکنا بند ہوا اور آہستہ آہستہ اس کا رنگ تبدیل ہو کر اصلی حالت پر آگیا۔ اب تمام راز مجھ پر عیاں ہو چکا تھا۔"

مسٹر ٹریلانی ایک لمحے کے لیے رکے، پھر کاربیک سے مخاطب ہوئے:

"تمہیں یاد ہو گا کہ شہزادی تارا کے حرم میں جا بجا اس سیاہ بلی کی تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ میں اسی وقت سے اس فکر میں تھا کہ آخر اس بلی کا تعلق شہزادی تارا سے کس نوعیت کا ہو سکتا ہے۔ ظاہر ہے اس نے یہ سب سامان اپنی حفاظت کے لیے کیا تھا۔ کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس رات اس بلی نے ڈبے سے نکل

کر مجھ پر حملہ کیا (جبکہ مَیں بے خبر سو رہا تھا)، تو یہ ڈبّا کسی نہ کسی طرح دبِّ اکبر کی روشنی میں آگیا ؛ ورنہ اِس سے پہلے یہ مکمل تاریکی میں چھُپا رہتا تھا۔ مَیں نے بعدازاں مسز گرانٹ سے پوچھا تھا کہ اِس ڈبّے کو تو کسی نے نہیں چھیڑا، تب اُس نے بتایا کہ ایک روز صفائی کرتے وقت خود اُس نے اسے سرکا کر کھڑکی کے پاس رکھ دیا تھا۔"

مسٹر ٹریلانی کی تقریر جاری تھی اور ہم سب خاموشی سے سُن رہے تھے کہ معاً مس ٹریلانی نے اپنی دِلکش آواز میں کہا :

"ڈیڈی، جب وہ بلّی اس ڈبّے سے باہر نکلی اور میرے پیر چاٹنے لگی، تو مجھے یوں محسوس ہُوا جیسے مَیں آپ میں سے کسی کو بھی نہیں پہچانتی۔ میں اُس وقت آپ کی زبان بھی نہیں سمجھ رہی تھی، بلکہ خود بخود ہی میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ مجھے اپنی کہنی پر سے کپڑا ہٹا دینا چاہیے۔ اُس وقت مجھے کچھ ایسا احساس ہوا جیسے اپنی کہنی سے خون کے چند قطرے ٹپکا کر بلّی کو بھینٹ دے دینا میرے لیے کوئی نئی بات نہیں ہے اور اُس وقت مجھے ڈر بھی نہیں لگا۔"

"میری بچّی، تم ٹھیک کہتی ہو —— یہ خُدا کے بھید ہیں، وہی بہتر جانتا ہے۔ تم آئینے میں اپنی شکل دیکھو، کیا تمھیں اندازہ نہیں ہوتا کہ تم ہُو بہُو شہزادی تارا کی سچّی تصویر ہو۔ تم اس وقت پیدا ہوئی تھیں جب مَیں اور میرا دوست کاربیک ملکہ تارا کے ہَرَم میں اس کے قریب کھڑے تھے اور وہ ہماری طرف دیکھ کر مُسکرا رہی تھی۔ پانچ ہزار سال سے اُس کی رُوح کو سکون نہیں مِلا ہے۔ اب وہ تمھارے جسم میں سَما چکی ہے۔ اُسے سکون کی ضرورت ہے۔ ابدی سکون کی —— لیکن اس کے لیے تمھیں ایک عظیم ایثار کرنا ہو گا۔"

"مَیں ہر ایثار اور قربانی کے لیے تیار ہُوں۔" مس ٹریلانی نے جوش سے کہا میرا دِل کسی ان جانے خوف سے لرز گیا۔ خدا معلوم اِس بے گناہ اور حسین لڑکی کو کِس قصور کی پاداش میں کون سی قربانی دینی پڑے گی۔ دوسرے ہی لمحے

مسٹر ٹریلانی نے مدّھم لہجے میں کہا :

"میری عزیز بیٹی، گھبراؤ نہیں —— شہزادی تارا کی رُوح، جو تمھارے جسم پر قابض ہے، ہم سے کوئی انتقام لینا نہیں چاہتی ؛ ورنہ اُس کا کٹا ہُوا ہاتھ مدّتوں پہلے ہم سب کا گلا گھونٹ چکا ہوتا۔ وہ تو سکون ... مستقل اور ابدی سکون کی طالب ہے ... گذشتہ سولہ برس کی مسلسل تحقیق اور تجسّس کے بعد مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ وہ اِس سے پیشتر بھی کئی بار اپنی رُوح دوسرے جسموں میں منتقل کر چکی ہے، لیکن کسی نے بھی اُسے ابدی سکون بخشنے کا اہتمام نہیں کیا۔ اب وقت آگیا ہے کہ وہ کالے علم کے پھندے سے نکلے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے عذاب سے نجات پائے، لیکن یہ کام اِتنا آسان نہیں، جتنا ہم سمجھے ہوئے ہیں۔ وہ علم، جو اَب تک شہزادی تارا کی حفاظت کرتا آیا ہے اور وہ تمام اشیا جو اس کے اردگرد پہرے داروں کی طرح جمی ہوئی ہیں، اتنی آسانی سے نابُود نہ ہوں گی۔ وہ بھی قربانی طلب کرتی ہیں۔"

مسٹر ٹریلانی نے چند لمحے توقف کیا، پھر بھرائی ہوئی آواز میں تقریر جاری رکھی:

"مَیں چاہتا ہوں کہ آج رات تک سارا کام ختم ہو جانا چاہیے۔ ایک ایک لمحہ قیمتی اور اہم ہے۔ ممکن ہے اِس دوران میں کوئی نئی بات ہو اور ہمارا منصوبہ دھرا رہ جائے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہم سب پُوری توجّہ اور استقلال سے تیار ہوں۔ اِسی میں سب کی بھلائی اور فائدہ ہے۔"

اُس نے کمرے میں گھومتی ہوئی نظر ڈالی۔ ہر فرد پتھر کے بُت کی مانند اپنی اپنی نشست پر بے حس و حرکت بیٹھا تھا اور پلک جھپکائے بغیر مسٹر ٹریلانی کو گھُور رہا تھا۔ میرے دائیں جانب مس ٹریلانی اور بائیں ہاتھ پر پروفیسر کاربیک تھا۔ مَیں نے کنکھیوں سے ان کے چہروں کا جائزہ لیا۔ دونوں کے چہروں پر مختلف اثرات تھے۔ مس ٹریلانی کا حسین اور دِل کش چہرہ نامعلوم خوشی کے جذبات کا مظہر تھا۔ اس کے کانوں کی لَویں سُرخ تھیں اور آنکھیں تاروں کی مانند چمکتی تھیں

اس کے برعکس پروفیسر کاربیک کا چہرہ ..... خدا کی پناہ ... بالکل سیاہ نظر آتا تھا اور سر کے بال قطعی سفید ——— اس کے پھولے ہوئے گال دھنس چکے تھے اور آنکھوں میں زردی ہی زردی تھی۔

دفعتہً وہ اپنی نشست سے اُٹھا اور مؤدبانہ انداز میں مسٹر ٹریلانی سے کہنے لگا:

"جناب والا، میری خواہش ہے کہ مجھے اس منصوبے میں شامل نہ کیا جائے۔ میں بہت جلد یہاں سے رخصت ہو جانا چاہتا ہوں۔"

"آہ ——— آخر کیوں؟" مسٹر ٹریلانی نے چلا کر کہا۔ وہ غیظ و غضب کی ہیبت ناک تصویر بن گیا۔ اس کے منہ سے غصّے کے مارے جھاگ اُڑنے لگے اور آنکھیں لال انگارہ ہو گئیں۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کی حالت قدیم زمانے کے اُن فرعونوں سے ملتی جلتی ہے جن کی ہیبت اور دہشت سے لوگ تھر تھر کانپتے اور اُن کے آگے سجدے میں گرتے تھے۔

"تم یہاں سے ہرگز نہیں جا سکتے۔ میری اجازت کے بغیر اگر تم نے اس مکان سے قدم باہر رکھا تو... تو تم جانتے ہو تمہارا کیا حشر ہو گا۔"

کاربیک کا جسم تنکے کی طرح کانپنے لگا۔ وہ گھٹنوں کے بل جھک گیا اور عاجزانہ لہجے میں کہا:

"میں آپ کے حکم کا تابع ہوں جناب والا، میں کہیں نہ جاؤں گا۔"

"آہا.... اب ٹھیک ہے، بالکل ٹھیک.... ہاں، تو میں کیا کہہ رہا تھا ... یاد آیا.... میں اُس قربانی کا ذکر کر رہا تھا جو میری عزیز بیٹی، شہزادی تارا کی خاطر دینے والی ہے۔ آؤ بیٹی، میرے پاس آ جاؤ۔"

مس ٹریلانی اپنی جگہ سے اُٹھی اور آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اپنے باپ کے پاس پہنچ گئی۔ مسٹر ٹریلانی نے اس کا دایاں ہاتھ تھام لیا اور کہنی برہنہ کر کے اُس سُرخ دائرے کو غور سے دیکھنے لگا جو کہنی کے جوڑ سے ذرا نیچے کھنچا ہوا تھا۔

"کیا تم اپنے ہاتھ کو یہاں سے کٹوانے کے لیے تیار ہو بیٹی؟" مسٹر ٹریلانی نے یکایک ڈرامائی انداز میں کہا اور میں اپنی نشست سے اُچھل پڑا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے کمرے کے در و دیوار گھومتے ہوئے محسوس ہوئے۔ پھر میں نے فرطِ جوش سے پاگل ہو کر کہا:

"مسٹر ٹریلانی یہ بھیانک مذاق ختم کیجیے۔ میں آپ کو تنبیہ کرتا ہوں کہ یہ حرکت نہ صرف وحشیانہ ہے، بلکہ خلافِ قانون بھی ہے۔ آپ کو اس کا خمیازہ بھگتنا ہو گا۔"

کمرے میں دیر تک موت کی سی خاموشی طاری رہی۔ ہر شخص کی نظریں مجھ پر گڑی ہوئی تھیں اور اس سے پہلے کہ مسٹر ٹریلانی کچھ کہیں، میں نے گرج کر کہا:

"میں بہت دن سے یہ تماشا دیکھ رہا ہوں اور محض اس لیے چپ ہوں کہ مجھے اس خاتون سے دلی محبت ہے، مگر اب میں دیکھتا ہوں کہ آپ ایک فضول سے تجربے اور اپنے جنونی شوق کی خاطر اس کا ہاتھ کاٹنے کے درپے ہیں۔ میرے جیتے جی ایسا ہرگز نہ ہو گا۔ میں آپ کو خبردار کرتا ہوں کہ اگر کسی نے بھی جبر و تشدد کے ذریعے مس ٹریلانی کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی تو میں یہ معاملہ پولیس کے حوالے کر دوں گا۔"

میں نے دیکھا کہ اس دھمکی کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ مسٹر ٹریلانی غصّے سے دانت پیستے اور میری طرف گھورتے رہے۔ اُن کا بس چلتا تو مجھے کچا ہی چبا جاتے۔

"مسٹر مالکم روز..... ازراہِ کرم ....." پروفیسر کاربیک نے کچھ کہنے کی کوشش کی، مگر میں نے اُسے بھی ڈانٹ دیا:

"آپ خاموش رہیے مسٹر کاربیک، یہ میرے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔ ایک بے ہودہ اور بے سروپا کہانی پر ایمان لانا میرے بس میں نہیں، آپ لوگوں نے کیا خوب ڈھونگ رچایا ہے۔ یہ سب سحر کے کرشمے ہیں۔ سات تاروں والا یاقوت... شہزادی تارا کی پانچ ہزار سال پرانی ممی ... دمکنے والا ڈبا... سات اُنگلیوں کا کٹا ہوا ہاتھ ... کالی بلی .... یہ سب بکواس ہے ....."

آپ لوگ دیوانے ہیں اور آپ کا اصل مقام پاگل خانہ ہے۔"

"اُف خدایا . . . ." کاربیک چلایا۔ "مَیں پاگل ہو جاؤں گا۔ مسٹر ٹریلانی کیا آپ اِس نوجوان کو تفصیل سے سب کچھ نہیں بتا سکتے؟"

"اب بتانے کا وقت گزر چکا میرے دوست۔" مسٹر ٹریلانی نے دھیمے لہجے میں کہنا شروع کیا۔ "افسوس کہ آج کل کے نوجوان، جنھیں دو حرف آ گئے ہیں، اپنے سے بڑوں اور بزرگوں کی عزت کرنا بھی بھول گئے ہیں۔ اگر اِس نوجوان کو میری بیٹی سے سچی محبت نہ ہوتی اور دوسری طرف میری بیٹی بھی اسے دل و جان سے نہ چاہتی تو بخدا ابھی اِس بات کا فیصلہ ہو جاتا کہ ہم دونوں میں سے کس کو اِس دنیا میں رہنا ہے۔ بہرحال اِس نوجوان کے لیے میری آخری نصیحت یہ ہے کہ اگر وہ میری بیٹی کو زندہ سلامت دیکھنا چاہتا ہے اور ہمیشہ کے لیے اپنانے کا خواہش مند ہے تو چُپ چاپ بیٹھ کر وقت کا انتظار کرے۔ بصورتِ دیگر اسے کہیے کہ یہاں سے چلا جائے۔"

"مَیں ہرگز نہیں جا سکتا اور اگر گیا تو کان کھول کر سُن لیجیے کہ آپ کی بیٹی بھی میرے ساتھ جائے گی۔"

"لیکن اسی صورت میں کہ اس کا دایاں بازو کاٹ دیا جائے۔" مسٹر ٹریلانی نے اطمینان سے کہا۔

ممکن ہے اس موقع پر مَیں مشتعل ہو کر اِس خبطی بڈھے پر حملہ کر دیتا کہ خود مِس ٹریلانی نے اپنی شیریں اور پُرفسوں آواز میں مجھ سے کہا:

"مسٹر مالکم روز، صبر و تحمّل سے کام لیجیے۔ آپ حد سے بڑھتے جا رہے ہیں۔ بلاشبہ مَیں آپ سے محبت کرتی ہوں، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ میرے والد کی مسلسل توہین و تذلیل کیے جائیں۔ یہ ہاتھ تو کیا شے ہے، اپنے پیارے باپ کے حکم پر مَیں جان بھی دے سکتی ہوں۔"

مَیں نے اُس کے یہ الفاظ سُن کر دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ کیا واقعی یہ جلاد صفت باپ اپنی بیٹی کا ہاتھ کاٹ ڈالے گا۔

مجھے بہرحال پولیس کو اطلاع دینی چاہیے۔ مَیں اپنے دل میں یہ طے کر کے اُٹھا اور کسی سے کوئی بات کیے بغیر چلا آیا۔

سکاٹ لینڈ یارڈ کے انسپکٹر ڈولین نے جب یہ طویل داستان سُنی تو حیرت اور خوف سے اُس کی بُری حالت تھی اور جب میں نے اُسے بتایا کہ آج رات کو کسی وقت وہ خبیث بُڈھا اپنی بیٹی کا ہاتھ کاٹ ڈالے گا تو انسپکٹر میں صبر کی تاب نہ رہی۔ اُس نے جلد جلد ضابطے کی کارروائی کی۔ میرا بیان قلم بند کر کے دستخط لیے، تین چار ہٹے کٹے سپاہیوں کو ساتھ لیا اور ہم سب مسٹر ٹریلانی کے مکان کی طرف روانہ ہوئے۔

"مجھے پہلے ہی شک تھا کہ معاملہ کچھ گڑبڑ ہے۔" سارجنٹ ڈاؤ نے بڑبڑا کر کہا۔ وہ بھی ہمارے ساتھ تھا۔ "خدا کرے ہم وقت پر پہنچ جائیں . . . آہ، بیچاری لڑکی۔ مجھے اس پر ترس آتا ہے۔ کس دیوانے کے گھر اس نے جنم لیا اور وہ بے وقوف بڈھا۔ جو اُس روز مجھ سے لڑ پڑا تھا، مجھے تو وہ بھی کوئی بد رُوح ہی نظر آتا ہے۔"

اُس نے کوچبان کو گھوڑوں کی رفتار اور تیز کرنے کا حکم دیا۔ آدھ گھنٹے بعد ہماری گاڑی مسٹر ٹریلانی کے محل نما مکان کے صدر دروازے پر رُکی۔ ہر طرف ایک ہیبت ناک سناٹا طاری تھا اور مکان کے اندر گھُپ اندھیرا ــــ روشنی کی کوئی کرن جھانکتی نظر نہ آتی تھی۔ دروازہ بے تحاشا پیٹنے کے باوجود نہ کھلا تو انسپکٹر ڈولین نے اپنے ماتحت سپاہیوں کو حکم دیا کہ دروازہ توڑ دیا جائے۔ ابھی دروازہ توڑنے کی تدبیروں پر غور ہو رہا تھا کہ دروازہ یک لخت کھُل گیا اور مسز گرانٹ کا سُتا اور ڈھلے ہوئے کپڑے کی مانند سپید چہرہ نظر آیا۔

"آہ .... مسٹر مالکم روز، آپ آ گئے . . . ." اُس نے ہانپتے ہوئے کہا۔ "جلدی کیجیے، وہ اپنی بیٹی کو تجربہ گاہ میں لے گیا ہے ــ کاربیک بھی وہیں ہے اور ڈاکٹر وِنچسٹر بھی ــ"

ہم اندھیرے میں ٹھوکریں کھاتے اور گرتے پڑتے اُوپر کی منزل کی طرف

بھاگے۔ معاً ہولناک چیخوں سے سارا مکان لرز اُٹھا اور پھر سفید سفید دُھواں، جس میں عجیب سی مدہوش کُن خوشبو شامل تھی، ہمارے نتھنوں میں آن گھُسا۔ مَیں نے آخری بار کوشش کی اور ایک ہی ہلّے میں مسٹر ٹریلانی کے کمرے کے نزدیک پہنچ گیا۔ چیخوں کی آواز اسی میں سے آ رہی تھی۔ مَیں نے ایک زوردار لات دروازے پر جمائی۔ دھماکے سے دروازہ کھُلا اور میری نظر سب سے پہلے مسٹر ٹریلانی پر پڑی۔ چمکتا ہوا کلھاڑا اُس کے ہاتھ میں تھا، مس ٹریلانی اس کے قریب بے ہوش پڑی تھی اور اس کا دایاں بازو سات ستاروں والے ڈبے پر کہنی تک برہنہ، کلھاڑے کی زد میں تھا۔ اُسی لمحے میری نظریں دائیں گوشے میں پڑیں اور جسم میں سے جیسے جان نکل گئی۔ اُس گوشے میں شہزادی تارا اپنے پُورے جاہ و جلال کے ساتھ کھڑی مُسکرا رہی تھی۔ اُس کا کٹا ہوا دایاں بازو اُوپر اُٹھا ہُوا تھا اور بائیں ہاتھ میں اُس نے اپنا سات انگلیوں والا پنجہ پکڑ رکھا تھا۔ سیاہ رنگ کی ایک بلّی اُس کے قدموں میں بیٹھی اپنی سبز سبز نظروں سے بے ہوش پڑی مس ٹریلانی کو دیکھ کر غرّا رہی تھی اور مکان میں گونجنے والی آواز اسی منحوس بلّی کی تھی۔

آہ، وہ لمحہ.... مَیں زندگی بھر نہ بھُول سکوں گا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ صدیاں گزر گئی ہیں۔ مسٹر ٹریلانی نے مجھے دیکھتے ہی کلھاڑا تیزی سے گھُمایا اور اپنی بیٹی کے بازو پر مارنے ہی والا تھا کہ مَیں نے بڑھ کر اُسے دھکّا دیا۔ وہ اوندھے منہ پرے جا گرا اور اس کے منہ سے ہولناک چیخ نکلی۔ چشم زدن میں مَیں نے مس ٹریلانی کو اپنے ہاتھوں پر اُٹھایا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ جونہی میں کمرے سے باہر نکلا، مکان میں زلزلہ سا آیا اور پھر مسٹر ٹریلانی کے کمرے میں آگ بھڑک اُٹھی اور تیزی سے ہر شے کو اپنی لپیٹ میں لینے لگی۔

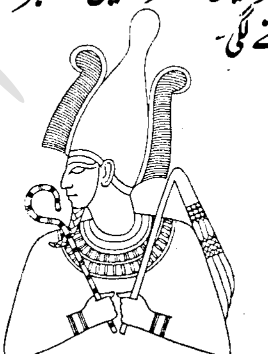

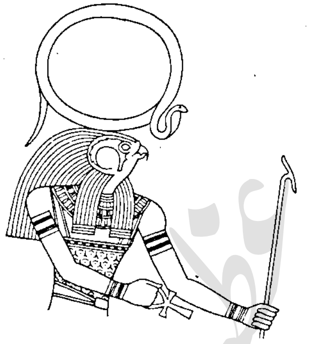

آخری تجربہ

مجھے اچھی طرح یاد نہیں کہ آگ کس طرح بجھی اور ہم لوگ کیونکر زندہ بچے، اتنا یاد ہے کہ مسٹر ٹریلانی نے پولیس افسروں اور آگ بجھانے والی جماعت کو اپنی باتوں سے مطمئن کر کے واپس بھیج دیا تھا اور اُنہیں بتایا تھا کہ آگ محض اتفاقیہ طور پر لگی ہے۔ اس کے بعد مسٹر ٹریلانی نے اپنی بیٹی کو اپنے کمرے میں بُلایا اور دیر تک اُس سے باتیں کرتے رہے۔ جب باپ بیٹی کمرے سے باہر آئے تو اُن دونوں کے ہونٹوں پر پُراسرار تبسّم کھیل رہا تھا۔

رات کے کھانے پر ہم سب جمع ہوئے، تب مسٹر ٹریلانی نے کہا:

"حضرات، مَیں جو تجربہ کرنا چاہتا ہُوں، وہ بے حد ضروری ہے۔ آپ شاید اُس کی اہمیّت کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ شہزادی تارا ابھی تک ہماری دست رس ہے اور اگر ہم نے اُس کی رُوح کو سکون نہ پہنچایا، جس کی وہ ہم سے توقع کرتی ہے، تب یقین کیجیے دنیا کی کوئی طاقت ہمیں مَوت کے پنجے سے نہیں بچا سکتی۔ لہٰذا یہ تجربہ ناگزیر ہے۔ مارگریٹ کا اِس تجربے میں شامل ہونا لازمی ہے۔ گزشتہ رات مسٹر مالکم رُوز نے میرے تجربے میں مداخلت کی اور اسے ناکام بنا دیا۔ یہ اِن کی ایسی فاش غلطی تھی کہ اگر مَیں ذرا بھی چُوکتا تو ہم سب کی زندگی کا خاتمہ تھا۔

وہ تو دراصل مارگریٹ کے صبر و استقامت کا ایک امتحان تھا؛ ورنہ میں اس کا بازو ہرگز ہرگز نہ کاٹتا ——— مسٹر روز کو دھوکا ہوا۔ بہرحال پچھلی باتوں کو نظر انداز کر کے ہمیں آگے بڑھنا چاہیے۔ اس مرحلے پر میں بڑی صفائی سے عرض کروں گا کہ اب بھی کوئی صاحب ہماری جماعت سے الگ ہونا چاہیں تو انھیں خوشی سے اجازت ہے کہ الگ ہو جائیں۔"

یہ کہہ کر انھوں نے باری باری ڈاکٹر ونچسٹر، پروفیسر کاربیک اور میری جانب دیکھا۔ ڈاکٹر ونچسٹر نے کہا:

"جناب والا، آپ مجھے بخوبی جانتے ہیں کہ اس قسم کے واقعات و تجربات سے مجھ کو کتنی دلچسپی رہی ہے۔ میں سائنس اور جدید طب کا طالب علم ہوں، اس لیے اس تجربے سے میرے الگ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"یہی حال میرا ہے۔" کاربیک نے جواب دیا۔ "میری تو زندگی آپ کے ساتھ گزر گئی۔ اب آخری وقت میں کیا الگ ہوں گا۔ میں ہر طرح ساتھ ہوں۔"

"آفرین ——— صد آفرین ———" مسٹر ٹریلانی نے کہا۔ پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا:

"کہیے مسٹر روز، آپ کے کیا ارادے ہیں؟"

میں نے جواب دینے سے پہلے مارگریٹ کی طرف دیکھا۔ اس کی نظروں میں التجا تھی۔ بے پناہ التجا ———

آخر میں نے کہا:

"جناب، میں زندگی کے آخری سانس تک آپ کا ساتھ دوں گا۔"

"بہت خوب ——— مجھے آپ سے یہی امید تھی۔" مسٹر ٹریلانی نے خوش ہو کر کہا۔ اس کے بعد گفتگو ختم ہوئی۔ سب لوگ خاموشی سے کھانا کھاتے رہے اور جب کھانے سے فارغ ہوئے تو لائبریری میں آن بیٹھے۔ مسز گرانٹ نے گرم گرم قہوے کی پیالیاں سب کے سامنے رکھیں۔ پھر مسٹر ٹریلانی نے تقریر شروع کی:

"جیسا کہ آپ سب کو معلوم ہے، مجھے ابتداً ہی سے علومِ روحانی سے دلچسپی رہی ہے۔ زندگی میں بے شمار عجیب و غریب واقعات میں نے دیکھے ہیں اور سینکڑوں تجربے خود بھی کیے ہیں، لیکن اب جو تجربہ میں کرنے والا ہوں، وہ ان سب سے زیادہ عظیم اور بے حد خطرناک ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ ہماری اس مادی کائنات کے ساتھ ساتھ ایک روحانی کائنات کا وجود بھی ہے اور اس کا ایک الگ نظام ہے۔ قدیم دور میں، اور آج بھی، روح کی مادے پر فوقیت تسلیم کی جاتی ہے اور ان سے بے شمار ایسے کام لیے جاتے ہیں جو جسم کے لیے فوری طور پر سرانجام دینے ناممکن ہیں۔ موجودہ دور میں روح کی اہمیت کم ہو گئی ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ مشینوں نے ہمیں بہت سی سہولتیں بہم پہنچا دی ہیں اور جوں جوں جدید سائنس آگے بڑھے گی، انسان نت نئی چیزیں ایجاد کرے گا، اسی رفتار سے روح کی اہمیت کم اور مادے کی اہمیت بڑھتی جائے گی۔ بہرحال یہ ایک تفصیلی بحث ہے جس کی یہاں گنجائش نہیں۔ میں مختصر طور پر یہ عرض کروں گا کہ روحوں کی عظیم قوت سے کیونکر کام لیا جا سکتا ہے۔ روح کو تابع کرنے کا فن ہمیں ہر دور اور ہر ملک میں ملتا ہے۔ افریقہ کے قدیم قبائل اس فن میں یدِ طولیٰ رکھتے ہیں۔ مصر میں ہزاروں برس تک روحوں پر قبضہ پانے کا فن عروج پر رہا۔ اس کے ساتھ ساتھ جادو یا کالا علم بھی آگے بڑھتا رہا۔ یہ دراصل ان روحوں سے کام لینے کا ایک خاص طریقہ ہے جو دنیا میں پاک باز نہیں رہیں۔ زمانۂ قدیم میں کالا علم سیکھنے پر پابندی تھی اور یہ فن شاہی خاندان یا پجاریوں کے سوا کوئی نہ سیکھ سکتا تھا یا وہ افراد جنھیں فرعونِ وقت یا پجاری اجازت دے دیں۔ جیسا کہ آپ سب کو علم ہے، شہزادی تارا کو اس کے باپ فرعون انیتف نے ابتدا ہی میں کالا علم سکھایا تھا اور اسی علم کے ذریعے شہزادی نے خود اپنی روح پر قابو پایا۔ وہ جب چاہتی اپنے جسم سے روح کو الگ کر سکتی تھی۔ چنانچہ اس نے ابتدائی تجربے میں پورے ایک مہینے

تک اپنی رُوح کو جسم سے باہر رکھا۔ اُسے اپنے علم کے ذریعے پتہ چل گیا تھا کہ سب سے بڑا پجاری فرعون انیتف کے مرجانے کے بعد خود تخت پر قبضہ کرنے کی کوشش کرے گا اور شہزادی تارا کے نام کو فنا کرنا چاہیے گا۔ اُس دور میں کسی کے نام کو فنا کرنا سب سے بڑا جرم تھا؛ چنانچہ شہزادی تارا نے اپنی حفاظت کے انتظامات شروع کیے، مگر پجاری کا علم اُس سے کہیں زیادہ گہرا اور وسیع تھا۔ شہزادی تارا اپنا نام و نشان محفوظ نہ رکھ سکی اور دیکھ لیجیے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے ایک ہزار سال قبل تک کوئی شخص بھی شہزادی تارا کے نام سے آگاہ نہ تھا۔ خود اس کے ملک مصر میں، جہاں ہزارہا فرعونوں کے مقبرے تھے اور ان سب کی تاریخ روشن تھی، شہزادی تارا گمنامی کے پردے میں چھپ چکی تھی، مگر حقیقت میں ایسا نہ تھا ——— شہزادی تارا جانتی تھی کہ کئی ہزار برس گزر جانے کے بعد اس کا مقبرہ کھولا جائے گا اور اس کے فانی جسم کو شمال کی جانب لیجایا جائے گا اور چند سرپھرے لوگ اُسے سکون بخشیں گے ——— چنانچہ شہزادی نے اپنے علم کے زور پر ایسا انتظام کیا کہ اس کی رُوح کائنات کے بعید ترین حصّوں میں نہ جا سکے، بلکہ اپنے جسم کے آس پاس ہی منڈلاتی رہے ——— علم جوتش نے شہزادی کو بتایا تھا کہ اس کی قسمت دبّ اکبر سے وابستہ کر دی گئی ہے۔ یہ نہایت خوش نصیبی کی علامت تھی اور اس کا ثبوت یہ تھا کہ شہزادی کے دائیں ہاتھ میں پانچ کی بجائے سات اُنگلیاں تھیں ——— تب شہزادی نے مقدس بھونرے کی شکل کا ایک قیمتی یاقوت حاصل کیا اور ماہرینِ نجوم کے ذریعے اس یاقوت پر دبّ اکبر کے سات ستاروں کی شکلیں ایسے اوقات میں کندہ کرائیں جب یہ ستارے اپنے بُروج میں خوب روشن تھے اور ان کی کرنیں اُس یاقوت پر پڑ رہی تھیں۔ آپ یقین کیجیے کہ ان ستاروں کے نشان یاقوت پر کندہ کرنے میں سات سال، سات ماہ، سات دن اور سات ساعتیں صرف ہوئی تھیں۔ اب آپ کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ سات کا ہندسہ شہزادی تارا کی زندگی میں کس قدر

اہمیت رکھتا تھا۔ اس نے اپنے مقبرے کی دیواروں پر یہ سارے واقعات اور پیش گوئیاں درج کرا دیں تاکہ ہزاروں برس بعد جب ہم لوگ اس کے مقبرے میں داخل ہوں تو ہمیں سب کچھ پتہ چل جائے۔ اس نے اپنے جسم کی حفاظت کا انتظام بھی کیا، اور اس کے لیے خاص سحر کے ذریعے عقاب کی شکل کے تین چراغ تیار کرائے اور اپنے مقبرے کے اندر ایسے مقامات پر ان کو رکھ دیا۔ جہاں سے ان کی روشنی براہِ راست یاقوت پر پڑ سکے۔ ان چراغوں میں جلانے کے لیے اس نے ایک خاص قسم کا تیل بھی تیار کرایا۔ یہ تیل بہت بڑی مقدار میں تھا جو بعد میں بدّوؤں نے لُوٹ مار میں ضائع کر دیا؛ تاہم اس تیل کی تھوڑی سی مقدار ہمیں وہاں مل گئی اور میں نے برسوں اس کے تجزیے میں کھپا دیے، تب جا کر اُن عناصر کا علم ہُوا جن سے یہ تیل بنایا گیا تھا۔ اس میں بھی سات چیزیں شامل ہیں۔ اب میں نے ان عناصر کو مرکّب کر کے یہ تیل بھی تیار کر لیا ہے۔ جب یہ چراغ تیل ڈال کر دبّ اکبر کی روشنی میں رکھے جائیں گے، وہ اپنے آپ روشن ہو جائیں گے اور چند لمحے بعد شہزادی تارا کی رُوح حاضر ہو جائے گی ———

"اب اس بلّی کا قصّہ بھی سُن لیجیے جس کی ممی میرے کمرے میں رکھی ہے۔ یہ شہزادی تارا کی پالتو بلّی تھی اور اسے اپنی مالکہ سے جنون کی حد تک پیار تھا۔ اور یہ کیسا عجیب اتفاق ہے کہ بلّی کے دونوں پنجوں میں بھی سات سات انگلیاں تھیں۔ شہزادی تارا نے اپنی زندگی ہی میں اس بلّی کی روح پر قبضہ کیا اور بعد ازاں اس کی ممی بنوا کر اپنے مقبرے میں رکھی۔ اس کے بعد جب شہزادی تارا کا جسم اور رُوح جُدا ہوئے تب وصیّت کے مطابق اس کے خادموں نے بلّی کی ممی شہزادی تارا کے تابوت پر رکھ دی تاکہ ان دونوں کے جسم اور روحیں ساتھ ساتھ رہیں۔ مجھ پر حملہ کرنے والی مارگریٹ کی پالتو بلّی نہ تھی، بلکہ وہی شہزادی تارا کی بلّی تھی، جب اس کی رُوح نمودار ہوتی اور اپنے جسم میں سما جاتی تو بلّی میں جان پڑ جاتی۔

اُدھر شہزادی تارا کی رُوح بھی آجاتی اور مجھے مجبور کرتی کہ مَیں تجوری کھول کر وہ یاقوت نکالوں تاکہ شہزادی اپنے فانی جسم کو برباد ہونے سے بچا سکے۔ رُوحوں کو دیکھنے کی جانوروں میں ایک خاص حِس قدرت نے رکھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مارگریٹ کی پالتو بلّی کی اپنے کمرے میں آمد مجھے پسند نہ تھی اور مَیں نے مارگریٹ کو اسی لیے سمجھایا تھا کہ اس گھر میں جانور نہ پالے ——— اسی بلّی نے شہزادی تارا کی بلّی کی ممّی پر حملہ کیا تھا۔"

"خدا کا شکر ہے میری بلّی کے سر سے یہ الزام دُور ہُوا کہ اُس نے آپ کو زخمی کیا تھا۔" مارگریٹ نے ہنس کر کہا۔"

مسٹر ٹریلانی نے اپنی داستان جاری رکھی۔

"اب حال یہ ہے کہ شہزادی تارا کی رُوح اپنے جسم میں واپس جانے کے لیے بے قرار ہے۔ اس پر خدا نے جو عذاب کالے علم کی وجہ سے نازل کیا تھا، وہ عذاب اب دُور ہونے کو ہے، وحشیوں نے اس کے مقبرے میں داخل ہو کر ہنگامہ برپا کیا، اس کی لاش کی بے حُرمتی کی، سات ستاروں والے یاقوت کو چُرا کر کوڑیوں کے مول فروخت کیا گیا۔ اب شہزادی کی رُوح اُس وقت تک اپنا جسم حاصل نہیں کر سکتی جب تک ساتوں ستارے اپنے اپنے بُرج میں نہ آجائیں اور روشنی نہ دینے لگیں۔

"سات ستاروں والے یاقوت کو مَیں نے آہنی تجوری میں رکھ دیا تھا اور تجوری کھولنے کا طریقہ دُنیا میں میرے علاوہ اور کسی کو معلوم نہیں ہے؛ تاہم میں نے مسٹر مارون کے نام جو تحریر لکھی تھی، اس میں یہ طریقہ بھی احتیاطاً لکھ دیا تھا تاکہ اگر مَیں مر جاؤں تو میرے بعد تجوری کھولی جا سکے ——— شہزادی تارا کی رُوح نے وہ یاقوت حاصل کرنے کی بڑی کوشش کی، مگر مَیں اپنی زبردست قوّتِ ارادی کے باعث اس کی کوششوں میں حائل رہا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ مَیں موت کی سرحد تک جا پہنچا، پھر شہزادی کو مجھ پر ترس آیا اور اس نے خواب

میں مجھے ہدایت کی کہ اگر میں اس کی آتما کو سکون پہنچانے کا بندوبست کر دوں تو وہ آئندہ مجھے نقصان نہ پہنچائے گی ——— مَیں نے وعدہ کر لیا؛ چنانچہ مَیں فوراً ہوش میں آگیا۔ اگر تم لوگ میری ہدایت کے مطابق کام نہ کرتے تو مجھے دُنیا کی کوئی طاقت موت سے نہیں بچا سکتی تھی۔ نرس کینیڈی نے رُوح کو روکنے کی کوشش کی تھی، مگر اس کا جو حال ہوا، وہ تم نے دیکھ لیا۔ اگر شہزادی تارا کو ہماری خدمات کی ضرورت نہ پڑتی تو نرس کینیڈی اِس وقت قبر میں پڑی ہمیشہ کے لیے آرام کر رہی ہوتی۔"

دفعتہً ہچکیوں کی سی آواز میرے کان میں آئی۔ مَیں نے چونک کر دیکھا۔ مارگریٹ کا چہرہ شدّتِ جذبات سے سُرخ ہو رہا تھا اور اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی تھی۔ ہم سب حیرت اور خوف کی نظروں سے اُسے تکنے لگے۔ چند لمحے تک مسٹر ٹریلانی پر بھی سکتے کا سا عالم طاری رہا۔ آخر انھوں نے محبّت بھرے لہجے میں کہا:

"کیا بات ہے بیٹی، تم روتی کیوں ہو؟ نرس کینیڈی تو خدا کے فضل سے بالکل ٹھیک ہو گئی ہے۔"

"ابّا ——— مَیں نرس کینیڈی کی وجہ سے نہیں روتی ہوں، بلکہ مجھے شہزادی تارا کی بے حرمتی اور رسوائی پر رونا آرہا ہے ——— اُف، خدایا ——— ایسی جاہ و حشم والی شہزادی کا کیا حشر ہُوا۔ آج اُس کا فانی جسم در بدر کی ٹھوکریں کھا رہا ہے اور لافانی رُوح کائنات کی بے کراں وسعتوں میں سکون کے لیے بے چین ہے، آوارہ ہے.... خدا کے لیے اُسے سکون دیجیے۔ اُسے نیک رُوحوں کی دنیا میں پہنچا دیجیے۔ مَیں آپ کے پاؤں پڑتی ہوں۔"

مسٹر ٹریلانی کی آنکھوں سے بھی آنسو رواں ہو گئے اور اُنھوں نے آگے بڑھ کر اپنی پیاری بیٹی کو سینے سے لگا لیا، پھر اس کی پیشانی چومتے ہوئے بولے:

"میری بچّی، رومت، تو جس طرح کہتی ہے، وہی ہو گا ——— مگر یہ تو

دیکھ کہ یہ ساری آفتیں خود شہزادی تارا نے اپنے ہاتھوں برپا کی ہیں — اب دنیا میں ہم چند آدمیوں کے سوا کوئی اس کے صحیح راز سے آگاہ نہیں ہے اور اگر ہم نے اُسے سکون نہ دیا تو پھر وہ قیامت تک بھٹکتی پھرے گی اور نہ جانے کتنے انسان اس کے خونی پنجے کا شکار ہو کر موت کی آغوش میں چلے جائیں گے۔ بہرحال تو اطمینان رکھ —— مَیں اپنی جان کی بازی لگا کر بھی اُسے سکون دوں گا۔ چند دن کی تاخیر اور ہے، اس کے بعد مَیں اپنا عظیم تجربہ شروع کر دوں گا۔ مَیں نے کئی مشرقی ملکوں کے جادوگروں اور جوتشیوں سے اس سلسلے میں بعض معلومات طلب کی ہیں۔ مَیں دراصل دبِ اکبر کی آئندہ چالوں کے بارے میں صحیح صحیح جاننا چاہتا ہوں کہ یہ ساتوں تارے کس دن اور کس وقت اپنے اپنے برج میں روشن ہوں گے۔ قاہرہ میں ایک سو دس برس کی عمر کا ایک بُڈھا جوتشی رہتا ہے۔ وہ ماہرِ فلکیات ہے۔ مَیں نے اُسے بھی خط لکھا ہے۔ یقیناً اس کا جواب ایک دو روز میں آ جائے گا۔ آپ کو معلوم ہے کہ مصر کے شہرۂ آفاق اہرام جب تعمیر کیے گئے تو سب سے پہلے ستارہ شناسوں ہی نے اُن کی جائے تعمیر کا نقشہ مرتّب کیا تھا۔ یہ سب اپنے اپنے فن میں یکتا تھے اور یہی سبب ہے کہ تینوں اہرام پانچ ہزار برس گزر جانے کے باوجود سینہ تانے زمین کے سینے پر کھڑے ہیں۔ گردشِ لیل و نہار ان کا بال بھی بیکا نہیں کر سکی ہے اور ماہرین کا اندازہ ہے کہ یہ اہرام ابھی ہزاروں برس تک اِس طرح کھڑے رہیں گے۔"

اس کے بعد اُنھوں نے اپنی گھڑی پر نگاہ ڈالی اور کہا:

"رات کے گیارہ بج رہے ہیں۔ اب آپ لوگ آرام فرمائیے۔ بقیہ باتیں کل ہوں گی۔"

اگلے روز پتہ چلا کہ قاہرہ کے اُس جوتشی کا خط مسٹر ٹریلانی کو مل گیا ہے جس میں اُس نے لکھا ہے: کئی صدیوں بعد یہ اتفاق ہو رہا ہے کہ ساتوں ستارے

ایک ہی وقت میں اپنے اپنے بُرج میں داخل ہوں گے اور ان کی روشنی بھی ایک جیسی ہو گی۔ اس خبر سے ہم سب کو حیرت ہوئی اور مسٹر ٹریلانی کا خوشی کا تو کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ اُسی روز رات کو کھانے کے بعد ہماری میٹنگ لائبریری میں ہوئی۔ مسٹر ٹریلانی کا چہرہ فرطِ جذبات سے روشن تھا اور جب وہ بولے تو اُن کی آواز کانپ رہی تھی:

"دوستو، مَیں آپ کو خوش خبری دیتا ہوں کہ قاہرہ سے بڈھے جوتشی کا پیغام آ گیا ہے۔ اُس نے لکھا ہے کہ اگر وہ اتنا ضعیف العمر نہ ہوتا تو خود یہاں آتا اور ہمارے اِس تجربے میں شریک ہوتا! تاہم اُس نے مجھے ہدایت کی ہے کہ اس زبردست تجربے کے لیے لندن جیسا شہر کسی طرح بھی موزوں نہیں ہے۔ یہاں ہر وقت ہنگامہ اور شور برپا رہتا ہے۔ اس لیے بہتر ہے کہ کسی پُرسکون مقام پر یہ تجربہ کیا جائے۔ جہاں دُور دُور تک کوئی انسان یا حیوان نظر نہ آتا ہو —— میری رائے میں اس جوتشی کا یہ مشورہ بے حد قابلِ قدر ہے۔ لندن واقعی مناسب نہیں —— ایک تو یہ کہ گزشتہ حادثوں کی وجہ سے پولیس اور سکاٹ لینڈ یارڈ کو ہم پر طرح طرح کے شکوک اور شبہے ہو گئے ہیں۔ اگرچہ انھوں نے واضح طور پر ہمارے خلاف کوئی قدم تو نہیں اُٹھایا، مگر مجھے یقین ہے کہ اِس مکان کی شب و روز نگرانی کی جا رہی ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ ہم کوئی انوکھا جُرم کرنے کے منصوبے باندھ رہے ہیں۔

"دوسری بات یہ کہ مجھے اپنے موجودہ نوکروں چاکروں سے بھی اس تجربے کو پوشیدہ رکھنا ہو گا۔ یہ کم عقل لوگ نہ کسی چیز کو سمجھتے ہیں نہ کوئی بات ہضم کر سکتے ہیں۔ یُوں سارے شہر میں ڈھنڈورا پیٹیں گے اور طرح طرح کی غلط سلط باتیں عوام میں مشہور ہو جائیں گی۔

"تیسری بات جس سے میں خوف کھاتا ہوں، وہ اخباری رپورٹر اور فوٹو گرافر ہیں۔ اِن لوگوں کو دوسروں کے ذاتی معاملات میں مداخلت کا بے حد شوق

ہوتا ہے۔ ذرا سی بات کا بتنگڑ بنا کر پیش کرنا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ اگر ان لوگوں کو ذرا بھی پتہ چلا کہ ہم کیا کرنا چاہتے ہیں تو زمین آسمان کے قلابے ملا دیں گے اور ہماری زندگی دُوبھر ہو جائے گی؛ لہٰذا ان سے بچنا بھی بے حد ضروری ہے —— مَیں نے ان تمام امور پر گھنٹوں غور کیا ہے اور یہ فیصلہ کرنے میں کامیاب ہو گیا ہوں کہ ہمیں ایک دُور اُفتادہ مقام پر یہ تجربہ کرنا چاہیے۔ مَیں نے آج سے دو سال پیشتر ایک چھوٹا سا مکان کیلیون کے مقام پر خریدا تھا۔ یہ جگہ سمندر کے کنارے ہے اور وہاں اس موسم میں شاذ و نادر ہی کوئی نظر آتا ہے —— اس مکان میں برقی روشنی کا انتظام بھی ہے اور ہر طرح ہماری رہائش اور تجربے کے لیے مناسب ہے —— یہ مکان ایک بلند پہاڑی کی اوٹ میں تعمیر کیا گیا ہے اور ساحلِ سمندر سے کسی کو نظر بھی نہیں آتا؛ چنانچہ کسی کی مداخلت کا امکان نہیں ہے۔ اس کے چاروں طرف خاصی اونچی ایک سنگین دیوار بھی کھچی ہوئی ہے۔ ہم وہاں ایک سپیشل ٹرین کے ذریعے پہنچیں گے۔ اس کا انتظام مسٹر مارون کریں گے۔ یہ نہایت طویل اور تھکا دینے والا سفر ہو گا اس لیے سب لوگوں کو ابھی سے ذہنی طور پر تیار رہنا چاہیے۔ بہت سا ضروری سامان اور قیمتی اشیا بھی ہمیں وہاں لے جانی ہیں۔ ہم رات کو سفر کریں گے —— پنڈنگٹن کے اسٹیشن تک تمام سامان لے جانے کے لیے نوکروں اور گھوڑا گاڑیوں کا انتظام ہو گا۔ اس لیے مہربانی کر کے کل صبح سے سب سفر کی تیاری کریں اور اپنا اپنا ضروری سامان باندھ لیں۔ آدھی رات سے پہلے پہلے ہم یہاں سے نکل جائیں گے۔

"مسز گرانٹ کی سفارش پر میں نے اس مکان کے دو قابلِ اعتماد نوکروں کو وہاں لے جانے پر رضامندی کا اظہار کیا ہے۔ خود مسز گرانٹ ان نوکروں کے ساتھ علی الصبح کیلیون روانہ ہو جائیں گی اور مکان کو ہر طرح ہمارے آرام کے لیے ٹھیک ٹھاک کر دیں گی؛ کھانے پینے کی چیزوں کا وافر ذخیرہ

بھی کیا جائے گا۔"

قصّے کو مختصر کرتے ہوئے لکھتا ہوں کہ اگلے روز آدھی رات سے پہلے پہلے ہم سب پنڈنگٹن کو جانے والی ٹرین میں سوار ہو چکے تھے اور گاڑی تیز رفتاری سے اپنی منزل کی طرف جا رہی تھی۔ ہم سب ایک ہی خصوصی ڈبّے میں تھے اور بالکل چُپ چاپ —— ہر فرد اپنی فکر میں گم تھا کہ دیکھیے آیندہ کیا پیش آنے والا ہے۔

صُبح منہ اندھیرے جبکہ ہم اپنی اپنی جگہ لیٹے اونگھ رہے تھے کہ ایک گارڈ ہمارے ڈبّے میں آیا اور اُس نے عجیب داستان سنائی۔ کہنے لگا: جناب، گذشتہ رات خدا نے ہمیں بال بال بچایا۔ ہُوا یہ کہ گاڑی ڈالش اور ٹاین ماؤتھ کے درمیان تیزی سے چل رہی تھی کہ دُور سُرخ بتّی نظر آئی۔ ڈرائیور نے پھُرتی سے بریک لگائے اور گاڑی آہستہ آہستہ چلتی ہوئی وہاں تک پہنچی جہاں عین پٹڑی پر ایک عورت بائیں ہاتھ میں سُرخ لالٹین لیے کھڑی تھی۔ ڈرائیور کا بیان ہے کہ وہ عورت بے انتہا حسین تھی اور اس نے قدیم طرز کا کفن سے ملتا جلتا لباس پہن رکھا تھا۔ ڈرائیور اور اس کے نائب کو تجسّس ہُوا۔ وہ اس کے پیچھے پیچھے چلے۔ وہ عورت ایک پہاڑی کے قریب پہنچ کر مڑی اور نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ ڈرائیور اور اس کے مددگار دوڑے، مگر عورت کا کہیں پتہ نہ پایا۔ مگر کچھ فاصلے پر انھوں نے دیکھا کہ ایک بہت بڑا پتھر پہاڑی سے لڑھک کر آ گیا تھا اور اس نے لائن روک لی تھی۔ چنانچہ دوسرے لوگوں کی مدد سے اس وزنی پتھر کو لائن پر سے ہٹایا گیا اور تب گاڑی چلی —— اگر وہ پُراسرار عورت سُرخ لالٹین لے کر ڈرائیور کو آگاہ نہ کرتی تو خدا ہی بہتر جانتا ہے کیسا بھیانک حادثہ رونما ہوتا —— مگر حیرت ہے وہ غائب کہاں ہو گئی۔"

ہم سب آنکھیں پھاڑے، منہ کھولے، دم بخود گارڈ کی تقریر سُنتے رہے۔ اور جب وہ چلا گیا تو مسٹر ٹریلانی نے دبے ہوئے جوش سے کہا:

"وہ ضرور شہزادی تارا تھی —— یقیناً اسی نے مدد کی —— ورنہ ہم سب

کی تکا بوٹی ہو جاتی ——"

رات ٹھیک نو بجے ہم پنڈنگٹن پہنچ گئے۔ وہاں مسٹر ٹریلانی کے مشیرِ قانونی مسٹر مارون نے ہمارا استقبال کیا۔ وہاں دو تین گھوڑا گاڑیاں ہمیں کیپیون لیجانے کے لیے تیار کھڑی تھیں۔ نوکروں نے ٹرین میں سے ہمارا سامان جھٹ پٹ اتارا اور گھوڑا گاڑیوں میں لاد دیا۔ اس کے بعد ہم اپنی نئی منزل کی جانب روانہ ہو گئے۔

جس مکان کا ذکر مسٹر ٹریلانی نے کیا تھا، وہ واقعی نہایت سنسان اور غیر آباد پہاڑی علاقے میں بنایا گیا تھا۔ اس کے ایک طرف بیکراں سمندر تھا جس میں لہروں کا بے پناہ شور کانوں کے پردے پھاڑے ڈالتا تھا، دوسری طرف سنگلاخ چٹانوں کا عظیم سلسلہ تھا جو حدِ نظر تک جانب شمال پھیلا ہوا تھا۔ یہ مکان ایک ایسی ہی پہاڑی پر واقع تھا جسے چاروں طرف سے اونچی اونچی چٹانوں نے گھیر رکھا تھا۔ زمین کی سطح سے اس کی بلندی کسی طرح بھی ایک ہزار فٹ سے کم نہ تھی۔ وہاں تک پہنچنے کے لیے نہایت چکر دار پتھریلی پگ ڈنڈی سی بنی ہوئی تھی جس پر ہمارے گھوڑے ہانپ ہانپ کر دوڑ رہے تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ہم کسی اور سیارے پر سفر کر رہے ہیں۔

جب ہم قریب پہنچے تو مکان کے اندر جلتی ہوئی لالٹینیں اور قمقمے دکھائی دیے۔ باہر آہنی صدر دروازے پر مسز گرانٹ اپنے ماتحت نوکروں سمیت ہمارے استقبال کو کھڑی تھیں۔ فضا میں سردی ہر لحظہ بڑھتی جا رہی تھی اور تاریکی ہر دم روشنی کو نگل لینے کے لیے بے تاب تھی۔ مکان اندر سے خاصا فراخ اور خوش نما تھا۔ ہر کمرے میں آتش دان بنایا گیا تھا جہاں مسز گرانٹ نے آگ روشن کر رکھی تھی اور کمرے خوب گرم تھے۔

ڈاکٹر وینچسٹر کی تجویز پر سب نے گرم پانی سے غسل کیا اور تازہ دم ہو گئے۔ اگرچہ رات خاصی جا چکی تھی، مگر ابھی تک کسی نے کچھ کھایا نہ تھا، چنانچہ فوراً ڈنر

تیار کیا گیا اور ہم کھانے کی میز پر بیٹھے۔ اس کمرے کا رُخ سمندر کی جانب تھا جہاں سفید سفید جھاگ اُڑاتی لہریں ساحلی چٹانوں اور پتھروں سے سر ٹکرا رہی تھیں۔ چند لمحوں بعد مغرب کی جانب سے آہستہ آہستہ پچھلی رات کے زرد چاند نے اپنا چہرہ دکھایا اور سمندر کا منظر بے حد دلفریب نظر آنے لگا۔

کھانے سے فارغ ہو کر مسٹر ٹریلانی ہمیں ایک کمرے میں لے گئے اور بتایا کہ یہ اُن کی خواب گاہ ہے۔ وہاں بھی ایک بڑی آہنی تجوری دیوار کے ساتھ لگی کھڑی تھی اور شہزادی تارا کا تابوت، بلی کی ممی اور سات گوشوں والا ڈبا بھی اسی حالت میں رکھے گئے تھے جس حالت میں مسٹر ٹریلانی کی لندن والی خواب گاہ میں رکھے رہتے تھے۔

مسٹر ٹریلانی نے اپنے گرم اوورکوٹ کی اندرونی جیب سے ایک خوبصورت چرمی پرس نکالا اور اسے کھول کر دیکھا، پھر پریشان ہو کر اس کے ہر خانے میں انگلیاں ڈالنے لگے۔ اُن کے چہرے پر ایک رنگ آتا، ایک جاتا تھا۔ آخر انہوں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا:

"خدا رحم کرے . . . یاقوت گم ہو گیا —— یہ تو بڑا غضب ہوا۔"

مارگریٹ یہ سُن کر مسکرائی اور کہنے لگی:

"ابا، آپ پریشان کیوں ہوتے ہیں۔ جائیے اپنے دوسرے کمرے میں دیکھیے، ممکن ہے وہاں مل جائے۔"

پھر ہم سب تقریباً دوڑتے ہوئے مسٹر ٹریلانی کے دوسرے کمرے میں گئے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ سات ستاروں والا یاقوت کمرے کے فرش پر پڑا جگمگا رہا تھا۔ اس کے ساتوں ستاروں میں سے روشنی کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔ مارگریٹ کمرے میں نہیں آئی، بلکہ دروازے ہی میں کھڑی رہی۔ اس کا چہرہ ضبطِ جوش اور مسرت سے سیب کی طرح سُرخ ہو رہا تھا۔ مسٹر ٹریلانی نے لپک کر وہ یاقوت اُٹھایا اور مٹھی میں دبا کر خواب گاہ میں آئے۔ تجوری کھولی

اور اسے اس میں رکھ کر احتیاط سے دروازہ بند کر دیا۔ اس کے بعد سب لوگ اپنے اپنے کمروں میں گئے اور آرام کی نیند سو گئے۔

اگلے روز دوپہر کو مسٹر ٹریلانی نے ہمیں ایک جگہ جمع کیا اور کہنے لگے:

"چونکہ اب ہم تجربے کے ابتدائی مراحل میں داخل ہو گئے ہیں، اس لیے ضروری ہے کہ میں ایک اہم راز سے آپ کو آگاہ کر دوں۔ واقعہ یہ ہے کہ گزشتہ کئی صدیوں سے یہ راز ہمارے خاندان میں چلا آتا ہے اور ہمیں اجازت نہیں تھی کہ ہمارے خاندان یا نسل کا کوئی فرد اس راز کو کسی غیر کے سامنے کھول دے۔ مگر اب اس تجربے کی خاطر مجھے یہ راز کھولنا پڑ رہا ہے۔ آپ سب لوگ صدقِ دل سے عہد کریں کہ اس راز کو اپنے سینے تک محدود رکھیں گے اور کسی حال میں کسی غیر پر ظاہر نہ کریں گے؟"

سب نے باری باری قول دیا۔ اس کے بعد مسٹر ٹریلانی نے اپنی آواز مدھم کی اور کہا:

"میں نے اس سے پہلے آپ کو بتایا تھا کہ دو سال قبل میں نے یہ مکان خریدا تھا۔ مجھے معاف فرمائیے، یہ بات میں نے غلط کہی تھی۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ یہ مکان صدیوں سے ہمارے خاندان کی ملکیت ہے اور اس کے اندر کئی خفیہ تہ خانے اور غار ہیں جو آپس میں ملے ہوئے ہیں۔ ایک راستہ سمندر کی جانب بھی نکلتا ہے۔ آپ کو معلوم ہو گا کہ صدیوں تک انگلستان مسلسل خانہ جنگی اور بدامنی کا شکار رہا ہے۔ ایسے حالات میں شاہی خاندان کے افراد کی جانوں کو ہر وقت خطرہ لاحق رہتا ہے۔ چنانچہ جب بھی خطرہ نمودار ہوتا، شاہی خاندان کے بیشتر افراد اس مکان کے تہ خانوں میں پناہ لیتے۔ اس کے بعد عرصے تک بحری قزاقوں نے اس مکان پر قبضہ کیے رکھا۔ آئیے، اب میں وہ غار اور تہ خانے آپ کو دکھاتا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکلے، ہم سب اُن کے پیچھے پیچھے تھے۔ مکان

کے عین وسط میں پہنچ کر مسٹر ٹریلانی نے ایک ستون پر ہاتھ رکھا۔ فوراً ہی فرش میں ایک خلا نمودار ہوا اور سیڑھیاں نظر آئیں۔ مسٹر ٹریلانی نے چند لمحے گندی ہوا کے نکل جانے کا انتظار کیا، پھر سب سے پہلے خود اترے، اس کے بعد دوسرے افراد ——— سیڑھیاں پتھر کی بنی ہوئی تھیں اور ان پر جابجا پھسلن سی تھی گھُپ اندھیرا نہ تھا، بلکہ نادیدہ روشن دانوں سے ہلکی ہلکی روشنی برابر آ رہی تھی۔

تہ خانے میں اُتر کر مسٹر ٹریلانی نے ایک جگہ ہاتھ رکھ کر زور دیا۔ دوسرے ہی لمحے دیوار شق ہو گئی اور ایک اتنا بڑا شگاف پیدا ہو گیا کہ اچھے قد و قامت کا آدمی سر جھکائے بغیر اس میں سے گزر سکتا تھا۔ ہم سب حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھتے آگے بڑھنے لگے۔ ہم نے اپنے آپ کو ایک تنگ، لیکن لمبی سی سرنگ میں پایا۔ یہاں بھی نمی کے آثار تھے اور تازہ ہوا کے جھونکے آتے تھے۔ یہ سرنگ ایک اور دروازے کے پاس جا کر ختم ہوئی۔ مسٹر ٹریلانی نے ایک طاقچے میں ہاتھ رکھا اور خفیہ بٹن دبایا۔ ایک ہلکی سی گڑگڑاہٹ کے ساتھ دروازہ کھُل گیا۔ اب ہماری نظروں کے سامنے ایک وسیع و عریض کمرہ تھا۔

"تشریف لائیے حضرات ـ" مسٹر ٹریلانی نے کہا۔ "اور داد دیجیے اُن کاریگروں کے فن کی جنھوں نے یہ مکان بنایا۔ آپ دیکھتے ہیں کہ اس کمرے میں تازہ ہوا کی آمد و رفت کا باقاعدہ نظام موجود ہے، بلکہ اس میں کئی خفیہ دروازے اور کھڑکیاں بھی رکھی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ اس کے بالکل نیچے ایک اور تہ خانہ ہے۔ ضرورت کے وقت اس میں بھی پناہ لی جا سکتی ہے۔ باہر سے اس مکان کو دیکھیے تو چھوٹا سا نظر آتا ہے، لیکن بلامبالغہ اس کے اندر ایک ہزار افراد کے مہینوں کیا، برسوں تک چھُپے رہنے کی گنجائش ہے اور کمال کی بات یہ ہے کہ ان تہ خانوں میں آپ کو کہیں کوئی جوڑ دکھائی نہ دے گا۔ ایجنٹا اور ایلورا کے عجائباتِ روزگار غاروں کی طرح یہ غار بھی چٹانوں کو تراش تراش کر بنائے گئے ہیں۔"

میں، ڈاکٹر ونچسٹر اور پروفیسر کاربیک دم بخود تھے۔ مسٹر ٹریلانی نے کاربیک کی طرف رُخ کر کے کہا:

"کیوں دوست، جگہ پسند آئی؟ میں نے اس عظیم اور تاریخی تجربے کے لیے یہی غار پسند کیا ہے ـــــ آپ دیکھتے ہیں کہ اس کی بناوٹ اور بیرونی اور اندرونی ماحول تقریباً ویسا ہی ہے جیسا ساحروں کی وادی میں شہزادی تارا کے مقبرے کا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ شہزادی تارا کو یہاں اجنبیت کا احساس زیادہ نہ ہوگا۔ اس کی رُوح اپنے قالب میں آنے کے لیے بے چین ہے۔ مگر یہ صرف اُسی وقت ممکن ہے جب ہمارا تجربہ کامیابی سے ہم کنار ہو۔ ناکامی کی صورت میں ـــ یہ تہ خانہ، ہم سب کے لیے بہترین مدفن کا کام دے گا۔"

کیسا دِل گردہ تھا اِس شخص کا ـــــ موت اور مدفن کا ذِکر یُوں کرتا تھا جیسے معمولی بات ہو۔ ہم سب پتھر کے بے جان بُتوں کی مانند خاموش کھڑے اسکی صُورت کو تکتے تھے، مگر اس کے لبوں پر نہایت فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔

"حضرات، اب بھی موقع ہے.... اگر کوئی صاحب ڈر گئے ہیں اور اُنہیں اپنی زندگی عزیز ہے تو میری طرف سے بخوشی اجازت ہے۔ وہ جا سکتے ہیں ـــ"

سب نے نفی میں گردنیں ہلائیں۔ اس کا مطلب تھا کہ ہم میں سے کوئی بھی جانے کو تیار نہیں تھا۔ مارگریٹ کی اور میری نظریں چار ہوئیں۔ میں نے اس کی آنکھوں میں محبّت کا بیکراں سمندر موجیں مارتے دیکھا، تب میں نے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا اور چپکے سے کہا:

"ہم دونوں اب اکٹھے ہی جئیں گے اور اکٹھے ہی مریں گے۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟"

جواب میں مارگریٹ نے بھی گرم جوشی سے میرا ہاتھ دبایا۔ مسٹر ٹریلانی نے یہ دیکھ کر خوشی سے کہا:

"میں نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ اب کوئی شخص مجھ پر الزام نہ دے گا کہ میں نے

ایک تجربے کی خاطر اُس کی زندگی سے کھیلنے کی کوشش کی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ میرا ضمیر بھی مطمئن ہے کہ میں جو کچھ کر رہا ہوں، وہ سائنس، طب اور روحانیت کے علوم کی طرف ایک فیصلہ کُن قدم ہے۔ بہر حال ـــ اب پہلا کام یہ ہے کہ اِس غار تک بجلی کی روشنی کا انتظام ہونا چاہیے۔ میں اِس کے لیے اپنے ساتھ لندن سے بجلی کا تار لیتا آیا ہوں۔"

اُس نے ایک نوکر کے ذریعے ایک چوبی صندوق کھلوایا اور اس میں سے بہت لمبا، لیکن نہایت نفیس تار نکالا اور ایک ماہر کاریگر کی طرح اِس تار کو اس انداز میں پھیلایا کہ خطرے کا باعث نہ بن جائے، پھر اس کا ایک سرا اُس ڈائنمو سے جوڑ دیا جو مکان کی ضرورت کے مطابق بجلی پیدا کرتا تھا۔ اس کے بعد اس نے غار میں مختلف مقامات پر بجلی کے کئی قمقمے لگائے اور بار بار ان کو جلا کر اطمینان کر لیا کہ وقت پر دھوکا نہ دیں گے۔ اِس کام سے فارغ ہو کر ہم نے شہزادی تارا کا تابوت اور دوسرا سامان اُٹھایا اور اسے بھی غار میں منتقل کیا۔ اِس دوران میں میں نے محسوس کیا کہ مارگریٹ کی حالت میں لمحہ بہ لمحہ ایک عجیب تغیر پیدا ہو رہا تھا ـــــ وہ ہمیں اجنبیوں کی طرح تکنے لگتی اور پھر ایسی زبان میں بڑبڑاتی جو کم از کم میری سمجھ سے بالاتر تھی ـــ میں نے کئی بار اس کے قریب ہونے اور کچھ پُوچھنے کی کوشش کی، مگر ہر بار وہ کترا کر الگ ہو گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ہم میں سے ایک ہونے کے باوجود اجنبی اور غیر ہے ـــــ آخر مسٹر ٹریلانی سے میں نے اِس تغیّر کا ذِکر کیا۔ ایک ثانیے کے لیے وہ چونکے، مگر پھر ہنس کر میرے شانے پر تھپکی دی اور کہا:

"گھبراؤ نہیں بیٹے، سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

جب تمام سامان غار میں سجا دیا گیا اور مسٹر ٹریلانی نے ہر شے کا غور سے جائزہ لے کر اطمینان کا اظہار کر دیا، تب ڈاکٹر ونچسٹر نے زبان کھولی:

"مسٹر ٹریلانی، یہ تو فرمائیے کہ تجربہ کب شروع ہوگا۔ میں بہت مضطرب ہوں ـــ"

"آہ ——— میں سمجھا ———" مسٹر ٹریلانی نے جواب دیا۔ "مصری جوتشی نے مجھے آگاہ کیا ہے کہ ساتوں ستارے ۲۵ رجولائی کی شب ساتویں ساعت میں اپنے اپنے بُرج میں داخل ہوں گے، چنانچہ ہمیں ۲۵ جولائی تک انتظار کرنا پڑے گا۔"

"مگر سوال یہ ہے کہ کیا ۲۵ رجولائی کی تاریخ ٹھیک رہے گی؟ اُس جوتشی کا حساب غلط بھی تو ہو سکتا ہے۔" ونچسٹر نے اعتراض کیا۔ اس پر مسٹر ٹریلانی مسکرائے اور کہنے لگے:

"جوتشی اپنے فن میں کامل ہے ڈاکٹر ونچسٹر ——— کیا آپ نے غور نہیں کیا کہ ۲۵ کا مجموعہ سات ہوتا ہے یعنی ۵ + ۲ = ۷ اور جولائی سال کا ساتواں مہینہ ہے؟"

حیرت سے ہمارے منہ کھُلے کے کھُلے رہ گئے۔

ہم سب انتہائی بے صبری اور اضطراب سے ۲۵ رجولائی کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔

اس دن تاریخ کا ایک ہولناک اور سب سے پُراسرار تجربہ ہونے والا تھا۔ ایسا تجربہ جس کے بارے میں موجودہ سائنس تصور بھی نہیں کر سکتی کہ کبھی عمل میں آسکتا ہے یا حقیقت کا رُوپ دھار سکتا ہے۔ مارگریٹ کا حال یہ تھا کہ وہ بالکل الگ تھلگ رہنے لگی تھی، اس کے حسین اور دل فریب چہرے کے گرد ہر وقت مایوسی اور خوف کے ہالے نظر آتے تھے۔ اس نے بلاضرورت بولنا چھوڑ دیا تھا۔ گھنٹوں اپنے کمرے میں بند رہتی اور اپنی پالتو بلّی سے کھیلتی رہتی جسے مسٹر ٹریلانی کے منع کرنے کے باوجود وہ اپنے ساتھ لے آئی تھی۔

مارگریٹ پر جب بھی میری نظریں پڑتیں، میرے جسم میں جھُرجھُری سی دوڑ جاتی۔ یُوں لگتا جیسے شہزادی تارا اپنے شاہانہ جاہ وجلال کے ساتھ میرے سامنے آگئی ہے۔ اس میں اور مارگریٹ میں بال برابر کا بھی فرق نہ تھا۔ ہندوؤں

ں آواگون کا مسئلہ ایک اہم عقیدے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس عقیدے کے طابق روحیں بار بار دُنیا میں آتی ہیں اور اپنے اعمال کے مطابق اُن کا جسم ہر بار تا رہتا ہے اور جب تک اُن کو کُلّی نجات حاصل نہیں ہو جاتی، وہ بار بار مختلف قالب اختیار کرتی رہتی ہیں ——— بہت سے واقعات بھی میرے سننے میں آئے تھے جن پر مَیں نے کبھی یقین نہ کیا تھا، لیکن اب مارگریٹ اور شہزادی تارا کا مقابلہ وموازنہ کرنے کے بعد میرے ذہن نے اِس حقیقت کو کسی قدر تسلیم کر لیا تھا کہ آواگون کا مسئلہ نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے پیچھے کچھ نہ کچھ ہے ضرور ———

کبھی کبھی میں سمندر کی طرف ہوا کھانے نکل جاتا اور گھنٹوں ایک چٹان پر بیٹھ کر لہروں کے مدّوجزر کا تماشا دیکھا کرتا۔ تجربے کی رات سے ایک روز پہلے شام کے وقت مَیں سمندر کی طرف گیا۔ چند لمحے بعد سورج غروب ہونے والا تھا اور اس کا سُرخ چہرہ دُور اُس کنارے پر جہاں آسمان اور زمین گلے ملتے نظر آتے تھے، آہستہ آہستہ پانی میں غائب ہو رہا تھا۔ آسمان کے مغربی حصّے میں نہایت دل فریب شفق پھُوٹ رہی تھی۔ یہ نظارہ ایسا بیخود کر دینے والا تھا کہ مجھے اپنے تن بدن کا بھی ہوش نہ رہا۔ نہ جانے کتنی دیر مَیں اسی عالم میں رہا۔ سمندر میں لمحہ بہ لمحہ جوش وخروش بڑھنے لگا۔ سورج غروب ہو گیا اور تاریکی تیزی سے ہر طرف پھیلنے لگی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ تمام رنگ غائب ہو گئے جو شفق کے ساتھ نمودار ہوئے تھے۔ پھر مغرب کی جانب سے کالی کالی گھٹائیں اُمڈتی نظر آئیں اور ہوا کے سرد جھونکے دم بدم تیز ہونے گئے۔ حتیٰ کہ میرا بدن کانپنے لگا۔ دفعتہً کسی نے اپنا نرم ہاتھ میرے شانے پر رکھ دیا۔ میرے حلق سے بے اختیار چیخ نکل گئی۔ مڑ کر دیکھا تو مارگریٹ اپنی تمام رعنائیوں کو جلو میں لیے کھڑی مُسکرا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں شراب کی سی مستی تھی اور یاقوتی ہونٹ شدتِ جذبات سے کانپ رہے تھے۔

"تم یہاں کب سے کھڑی ہو؟ معاف کرنا میں اس حسین منظر پر اتنا کھویا ہوا تھا کہ تمہارے قدموں کی آہٹ بھی نہ سن سکا۔"

"آہ مسٹر روز ــــ آپ تو ڈر کر چیخ اُٹھے ــــ" اس نے مسکرا کر کہا اور اس کے موتیوں کی لڑیوں جیسے دانتوں میں سے روشنی کی شعاعیں نکلتی نظر آئیں۔ "کل ڈیڈی اپنا عظیم تجربہ شروع کرنے والے ہیں اور آج رات ڈنر کے بعد اُنہوں نے سب کو ایک جگہ جمع ہونے کی ہدایت کی ہے۔ میں آپ کو بلانے آئی ہوں۔"

اس کے لہجے میں شوخی اور شرارت تھی۔ میں نے بے اختیار آگے بڑھ کر اُسے اپنی بانہوں میں جکڑ لیا۔ اُس نے کوئی مزاحمت نہ کی۔ میں نے اس کے کان میں کہا:

"مارگریٹ، تم میری زندگی ہو ــــ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکوں گا۔"

شرم و حیا سے اس کا چہرہ انار ہو گیا۔ وہ آہستہ سے الگ ہو گئی اور لرزتی آواز میں بولی:

"یہی حال میرا ہے ــــ اب دُعا کرو کہ ڈیڈی کا وہ تجربہ کامیاب ہو جائے ورنہ ہماری جانوں کا خدا ہی حافظ ہے۔"

اس کے بعد ہم دونوں ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے واپس آئے۔ مکان کے اندر ایک خاصی چہل پہل نظر آئی۔ پروفیسر کاربیک اور ڈاکٹر ونچسٹر بار بار ادھر سے اُدھر آتے جاتے دکھائی دیے۔ مسز گرانٹ اور دونوں خادم بھی بے انتہا مصروف اور مضطرب نظر آتے تھے

مسٹر ٹریلانی اپنے کمرے میں آرام کرسی پر بیٹھے خاموشی سے سگار پی رہے تھے۔ رات کے کھانے سے فارغ ہونے کے بعد سب لوگ اُسی تہ خانے میں جمع ہوئے جہاں اگلی رات وہ لرزہ خیز تجربہ ہونے والا تھا۔ گزشتہ کئی دنوں کی محنت سے مسٹر ٹریلانی اور پروفیسر کاربیک نے اس تہ خانے کی ہیئت اتنی بدل دی تھی کہ وہ اب شہزادی تارا کا مقبرہ نظر آ رہا تھا۔ مسٹر ٹریلانی نے ہر بات

ہمیں تفصیل سے بتائی اور کہا کہ چونکہ تہ خانے کا ماحول شہزادی تارا کے لیے بالکل اجنبی تھا، اس لیے کوشش کی گئی ہے کہ جب وہ جی اُٹھے تو کسی قسم کی اجنبیت محسوس نہ کرے۔ پروفیسر کاربیک کے بارے میں آج ہی پتہ چلا کہ وہ نہایت اعلیٰ درجے کا مصوّر بھی ہے۔ اُس نے تہ خانے کی دیواروں پر رنگوں سے اُن تمام تصویروں اور تحریروں کی ایسی عمدہ نقل نقش کر دی تھی جو شہزادی تارا کے مقبرے کی دیواروں پر کندہ تھیں۔

"دوستو، تجربے کی گھڑیاں قریب آن پہنچی ہیں۔" مسٹر ٹریلانی نے قہوے کا گھونٹ لیتے ہوئے تقریر کا آغاز کیا۔ "خدا سے دُعا کیجیے کہ یہ تجربہ کامیاب ہو، اسی میں ہم سب کی سلامتی ہے۔ ناکامی کی صورت میں ہمارا وہی حشر ہو گا جو اِس سے پیشتر شہزادی کے دشمنوں کا ہو چکا ہے۔ اب ہمیں یہ طے کرنا ہے کہ تجربے کا کون سا وقت مناسب اور صحیح ہو گا۔ اس معاملے میں ذرا سی کوتاہی یا غلطی تمام کیے کرائے پر پانی پھیر سکتی ہے۔ آپ سب لوگ شہزادی تارا کی سوانح سے کسی نہ کسی قدر واقفیت رکھتے ہیں، اِس لیے میں تفصیل میں نہ جاؤں گا؛ البتہ بعض موٹی موٹی باتیں دہرا دینا ضروری سمجھتا ہوں تاکہ تجربے کے لیے صحیح اور موزوں وقت کا فیصلہ کیا جا سکے۔

"آپ جانتے ہیں کہ شہزادی تارا آج سے پانچ ہزار سال برس قبل سرزمین مصر میں سریر آرائے سلطنت تھی اور اس کے حُسن و جمال اور جاہ و جلال کے چرچے دُور دُور تک پھیلے ہوئے تھے۔ پجاریوں سے خطرے کے سبب اُس نے کالا علم سیکھا اور اپنی قوتِ ارادی کو اس حد تک بڑھایا کہ وہ ایک ماہ تک کچھ کھائے پیے بغیر اطمینان سے دَم روک کر سوتی رہی۔ اُس نے آہستہ آہستہ اپنی قوتیں اس قدر بڑھائیں کہ خود اپنی رُوح پر قابو پا لیا اور ایسا انتظام کیا کہ جسمانی موت واقع ہونے کے بعد اسکی رُوح کائنات کے اُن حصّوں میں نہ جانے پائے جہاں اِس سرزمین سے رُخصت ہونے والوں کی روحیں جمع ہوتی رہتی ہیں۔ اگر ایک بار

بھی شہزادی کی رُوح اس کائنات کی حدوں سے نکل کر عالمِ بالا کی طرف روانہ ہو جاتی تو پھر اس کا جسم ہمیشہ کے لیے بے کار ہو جاتا اور وہ اپنے دشمنوں سے انتقام نہ لے سکتی۔ چنانچہ اس نے اپنی روح کی حفاظت کا انتظام کیا اور جسم کی دیکھ بھال بھی کرتی رہی۔ اس مقصد کے لیے اس نے سات کے عدد کو خصوصی طور پر اپنی قسمت سے وابستہ کر لیا تھا ——— اور یہ اتفاق کی بات ہے کہ آسمان کے وہ سات مشہور و معروف ستارے اس کے نگہبان تھے جنہیں ہم کرۂ ارضی کے لوگ مشتری، زحل، مریخ، عطارد، زہرہ، یورینس اور نیپچون کے ناموں سے جانتے پہچانتے ہیں۔ شہزادی تارا کی اُس سوانح سے، جو اس کے مقبرے میں دیواروں پر کندہ ہے، ہمیں یہ علم ہوا کہ اس نے اپنے جتنے کام بھی کیے، وہ سب غروبِ آفتاب کے وقت کیے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ غروبِ آفتاب کی ساعت نہایت اہم اور فیصلہ کن ہے۔ یوں بھی "کالا علم" سورج چھپنے کے بعد زیادہ مؤثر ہو جاتا ہے اور دنیا بھر کے جادوگر اور ساحر اسی ساعت کو اپنے لیے مفید اور بہتر جانتے ہیں، چنانچہ مَیں نے سات کے عدد کی رعایت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے یہ طے کیا ہے کہ سورج چھپنے کے بعد ساتویں گھنٹے کی ساعت شروع ہوتے ہی تجربے کا آغاز کر دیا جائے۔ آپ اگر غور کریں تو یہ حقیقت عیاں ہو جائے گی کہ تینوں مرتبہ مجھ پر اسی ساعت میں حملہ کیا گیا تھا۔ مَیں نے حساب لگا لیا ہے۔ کل سورج شام کے ٹھیک آٹھ بجے چھپے گا اور تجربے کی ساتویں ساعت تین بجے شب سے شروع ہو جائے گی۔ مَیں نے تینوں چراغوں میں تیل ڈال دیا ہے، اور انہیں جلا کر بھی دیکھ لیا ہے۔ بہرحال آج رات اور کل سارا دن آپ لوگ آرام کریں گے تاکہ وہ تھکن جو ہم سب پر سوار ہے، کسی حد تک دُور ہو جائے۔"

اس تقریر کے بعد مجلس برخاست ہو گئی۔ کسی نے کسی سے کوئی بات نہ کی۔ ماحول کچھ ایسا تھا کہ ہر شخص اپنے خیالات میں گم تھا۔ مارگریٹ اِک ادائے

بے نیازی سے سب کو الوداعی سلام کرتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اس کی پالتو بلی ساتھ تھی۔ مَیں ایک بار پھر مکان سے نکلا اور سمندر کی طرف چلا آیا۔ کالی گھٹائیں اب بھی آسمان پر تیزی سے جمع ہو رہی تھیں اور بجلی کبھی کبھار کوندتی تھی تو دُور تک سیاہ سمندر کی دیو پیکر موجیں اُبھرتی ڈوبتی نظر آنے لگتی تھیں۔ رات کی تازہ ہوا نے میرے دل و دماغ کو کسی قدر پُرسکون کر دیا اور مَیں سوچنے لگا کہ شاید اگلی رات زندگی کی آخری رات ہو، اور یہ بھی ممکن ہے کہ زندگی بھر کی خوشیاں مجھے اسی رات مل جائیں۔

۲۴ جولائی کا تمام دن آرام و راحت سے گزرا۔ چونکہ تجربے کے تمام انتظامات ہر طرح مکمل تھے، اس لیے کوئی خاص فکر نہ تھی۔ مسٹر ٹریلانی نے دونوں خادموں کو بھی رخصت کر دیا تھا اور اب اس ویران مکان میں جو ذی رُوح باقی رہ گئے تھے اُن کی تعداد بھی سات تھی۔ ذرا گن لیجیے۔

(۱) مسٹر ٹریلانی (۲) مس مارگریٹ ٹریلانی (۳) مالکم رُوز (۴) پروفیسر کاربیک (۵) ڈاکٹر ونچیسٹر (۶) مسز گرانٹ اور ساتواں مس مارگریٹ کی پالتو بلی سلیو۔

سہ پہر کو کھانے کے بعد مَیں سو گیا اور آنکھ اُس وقت کھلی جب پروفیسر کاربیک میرا شانہ ہلا کر کہہ رہا تھا:

"اُٹھو میرے عزیز، اُٹھو۔۔۔ وقت آن پہنچا۔"

یہ الفاظ اُس نے اس انداز میں کہے جیسے پھانسی کا وقت آن پہنچا ہے۔

"مسٹر ٹریلانی نے تمہیں یاد کیا ہے۔" اس نے پھر کہا۔ میں جلدی سے اُٹھا اور کاربیک کے ساتھ تہ خانے میں اترا۔ سورج غروب ہونے میں ابھی آدھ گھنٹہ باقی تھا۔ ڈاکٹر ونچیسٹر اور مسز گرانٹ وہاں پہلے سے موجود تھیں۔ میرے داخل ہونے کے دو لمحے بعد مارگریٹ بھی اپنی بلی کو گود میں لیے آ گئی۔ جونہی اس منحوس بلی نے شہزادی تارا کی پالتو بلی کی ممی کو دیکھا، اس کے بال کھڑے ہو گئے، آنکھیں چمکنے لگیں اور ساتوں پنجے باہر نکال کر بُری طرح غرّانے لگی۔

مارگریٹ نے آہستہ سے اس کے سر پر تھپکی دی تب وہ چُپ ہوئی، مگر پھر بھی وقفوں وقفوں سے غرانے کا کام جاری رکھا۔ مسٹر ٹریلانی نے تہ خانے کی ایک شیشہ دار کھڑکی کھولی، اس کا رُخ مغرب کی جانب تھا اور یہاں سے ڈوبتے سورج کا نظارا آسانی سے کیا جا سکتا تھا۔ ماحول بے حد سوگوار اور اُداس تھا۔ سمندر کا جوش و خروش بالکل دھیما پڑ چکا تھا اور اُفق کی جانب ایک سُرخ لکیر اُبھر رہی تھی۔ مَیں نے دیکھا کہ مارگریٹ پلک جھپکائے بغیر ڈوبتے سورج کو دیکھ رہی تھی، اس کا سانس زور زور سے چل رہا تھا اور چہرے پر پسینے کے قطرے موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔

جونہی سُورج غروب ہُوا اور سُرخ لکیر سرمئی رنگ میں بدلی، مارگریٹ نے ایک ایسے لہجے میں، جس کے اندر شاہانہ جاہ و جلال کا عنصر نمایاں تھا، یہ بات کہی:

"یہ دیوتاؤں کی رات ہے ـــــ کائنات پر انہی کی حکمرانی ہے ـــــ کاش، مَیں شہزادی تارا ہوتی تو آج میری سلطنت میں جشن منائے جاتے۔"

یہ کہہ کر وہ آگے بڑھی اور شہزادی تارا کی پالتو بلی کی ممی پر اپنا ہاتھ آہستہ سے رکھ دیا۔ ہم سب دم بخود اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ وہ اس وقت کسی اور ہی دنیا کی مخلوق نظر آتی تھی۔ اس کا چہرہ اتنا روشن پہلے کبھی نظر نہ آیا تھا۔ وہ اپنے گرد و پیش سے بالکل بے خبر اُفق پر اُس جگہ نظریں جمائے کھڑی تھی جہاں چند لمحے پہلے سُورج غروب ہُوا تھا۔ تہ خانے میں تاریکی کے سائے ہمیں گھیرے میں لے رہے تھے۔ ایک ہیبت ناک، اعصاب شکن سنّاٹا فضا پر طاری تھا، دفعتہً مارگریٹ کی پالتو بلی نے چھلانگ لگائی اور میری گود میں آن بیٹھی۔ مَیں نے پیار سے اس کی گردن اور پشت پر ہاتھ پھیرا اور یہ محسوس کر کے حیران رہ گیا کہ بلی کا جسم خوف سے کانپ رہا ہے۔ اس کے کان جُھکے ہوئے تھے اور آنکھوں کی چمک مدھم پڑ چکی تھی۔

یکایک مارگریٹ کو جیسے ہوش آ گیا۔ اُس نے اپنے والد کی طرف دیکھا اور مُسکرا کر بولی:

"ڈیڈی، سُورج غروب ہو چکا ـــــ اپنا کام شروع کیجیے ـــــ رات تیزی سے ہمارے قریب آ رہی ہے ـــــ کیا ہم کل کا سُورج دیکھ سکیں گے۔؟"

مسٹر ٹریلانی اُس وقت مجسّم سنجیدگی تھے۔ انہوں نے زبان سے کچھ نہ کہا، صرف گردن کو جنبش دی۔ پھر دائیں بائیں یوں دیکھا جیسے سپہ سالار لڑائی سے پہلے اپنی فوجوں کا آخری بار معائنہ کرتا ہے۔ ڈاکٹر ونچسٹر کے چہرے کی زردی اب سُرخی میں بدلتی جا رہی تھی۔ پروفیسر کاربیک پتھر کے بے جان بُت کی طرح ایک جگہ کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ ہر قسم کے تاثرات سے یکسر خالی تھا اور یوں نظر آتا تھا جیسے وہ ان سب باتوں سے قطعی بے نیاز ہے۔ مسز گرانٹ ایک وفادار خادمہ کی طرح اپنے فرائض انجام دینے کے لیے مستعد تھیں اور بار بار محبت بھری نظروں سے مارگریٹ کی طرف تکتی تھیں۔ مَیں اپنی کیفیت کیا عرض کروں عجیب اُمید و بیم کی حالت تھی۔ کبھی دل چاہتا کہ یہاں سے بھاگ نکلوں، کبھی سوچتا کہ بس یہ زندگی کی آخری شب ہے۔ پھر خیال آتا مارگریٹ کے بغیر جینا مرنا سب بے کار ہے۔ ممکن ہے میری زندگی کی مسرّتوں کا آغاز اسی لمحے سے شروع ہو گیا ہو۔ غرض متضاد کیفیات میرے قلب و دماغ سے گزر رہی تھیں۔

تہ خانے کے بالکل وسط میں شاہ بلوط کی بنی ہوئی ایک قیمتی میز پڑی ہوئی تھی، مسٹر ٹریلانی اس میز کے قریب آئے۔ اسی پر شہزادی تارا کی پالتو بلی کی ممی دھری تھی۔ انہوں نے اس ممی کو الٹا کر دیا۔ مارگریٹ کے سینے کا زیر و بم اور بڑھ گیا اور اس نے جوش سے کانپتی ہوئی آواز میں کہا:

"ڈیڈی، اب آپ کیا کرنے والے ہیں؟"

"مَیں سب سے پہلے اس بلی کی ممی کو ضائع کرنا چاہتا ہوں۔ شہزادی

تارا کو آج رات اس کی ضرورت نہ پڑے گی اور یوں بھی ہمارے لیے اس ممی کا باقی رہنا خطرناک ہے۔ چنانچہ اسے برباد کر دینے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔ میری بچّی، کیا تم ڈر تو نہیں رہی ہو؟"

"نہیں نہیں ــــ مجھے کوئی خوف نہیں ہے ــــ آپ اطمینان سے اپنا کام کیجیے۔" مارگریٹ نے جواب دیا۔

مسٹر ٹریلانی نے بہترین قینچیوں اور چاقوؤں کا پہلے ہی سے انتظام کر لیا تھا۔ انہوں نے تیز دھار والی ایک لمبی قینچی اُٹھائی اور بلّی کے جسم پر بندھی ہوئی پٹیوں کو آہستہ آہستہ کاٹنا شروع کر دیا۔ جونہی یہ عمل شروع ہوا، مکان زور سے ہلا جیسے زلزلہ آگیا ہو۔ باہر ہوا کے طوفانی جھکڑوں میں اور تیزی و تندی پیدا ہو گئی۔ سمندر جو چند لمحے پیشتر پُرسکون تھا، ایک دم جوش میں آگیا اور لہریں ہولناک آواز سے چٹانوں کی طرف بڑھیں اور سر ٹکرانے لگیں۔ مسٹر ٹریلانی نے بجلی کے طاقت ور قمقمے روشن کر دیے اور سمندر کی طرف کھلنے والی کھڑکی بند کر دی۔

جوں جوں ممی کی پٹیاں کٹ کٹ کر اُترتی رہی تھیں، میرا دل آپ ہی آپ بیٹھا جاتا تھا۔ خدا جانے اب کیا ہونے والا تھا۔

بلّی کی ممی کے بدن پر ان گنت پٹیاں جمی ہوئی تھیں اور ان پہ ایک عجیب قسم کا خوشبودار مسالہ لگا ہوا تھا۔ یہ پٹیاں نہایت باریک ریشم کی تھیں اور کئی ہزار سال گزرنے کے باوجود یہ ریشمی کپڑا روزِ اوّل کی طرح نرم اور غیر بوسیدہ تھا۔

آخر میں جب چند پٹیاں اتریں تو سرخ رنگ کے ننھے ننھے گالے سے تہ خانے کی فضا میں تیرنے لگے اور پھر بلّی کا پورا جسم ہماری نظروں کے سامنے آگیا۔ اُسے اِس حالت میں دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ پانچ ہزار سال قبل مری ہوئی بلّی کا جسم ہے۔ وہ بالکل صحیح حالت میں تھا، حتّٰی کہ اس کا ایک ایک رواں نہایت ملائم اور صاف شفاف تھا۔ بلّی کے دانت اور پنجے صحیح سالم تھے اور آنکھوں میں ویسی ہی چمک اور زردی موجود تھی جو زندہ بلیوں کی آنکھوں میں ہوا

کرتی ہے۔ یوں لگتا تھا جیسے کوئی دم میں اس کے حلق سے 'میاؤں میاؤں' کی آواز نکلنے والی ہے۔

ہم سب دیر تک اس بلّی کو دیکھتے رہے۔ پٹیاں اُترنے کے بعد بھی وہ عام بلیوں کے برعکس خاصے بڑے قد و قامت کی نظر آتی تھی۔ غالباً اس نسل کی بلیاں آج بھی بہت کم پائی جاتی ہیں۔ مسٹر ٹریلانی نے ہمیں آگے بڑھ کر بلّی کو قریب سے دیکھنے کا اشارہ کیا اور یہ معلوم کر کے کم از کم میرے تو رونگٹے کھڑے ہو گئے کہ اس بلّی کے پنجوں اور دانتوں پر خون اور گوشت کے جمے ہوئے لوتھڑوں اور دھبّوں کے نشانات نمایاں تھے۔ خون کے دھبّے کچھ زیادہ پرانے نہیں تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ منحوس بلّی حال ہی میں خون پیتی رہی ہے۔

"خدا کی پناہ ــــ یہ تو زندہ ہے ــــ" یہ پہلی آواز تھی جو ڈاکٹر ونچسٹر کے حلق سے برآمد ہوئی۔ "اس کے مُنہ پر تو تازہ خون جما ہوا ہے۔"

اُس نے جلدی سے اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر محدّب شیشہ نکالا اور اس کی مدد سے بلّی کے پنجوں اور دانتوں کا معائنہ کرنے لگا۔ اس کے چہرے پر ایک رنگ آتا، ایک جاتا۔ مسٹر ٹریلانی ڈاکٹر کے قریب ہی جھکے کھڑے تھے اور اُن کا سانس زور زور سے چل رہا تھا۔ آخر انہوں نے کہا:

"وہی بات ہوئی جس کا میں نے اندازہ کیا تھا۔ اسی بلّی نے رات کی تاریکی میں مجھ پر حملے کیے تھے ــــ"

"بے شک آپ صحیح کہتے ہیں ــــ" ڈاکٹر نے تائید کی۔ "دیکھ لیجیے اس کے پنجوں میں بھی سات سات ناخن ہیں۔" اس نے جلدی سے دوسری جیب ٹٹولی اور بلاٹنگ پیپر کا وہ ٹکڑا نکالا جس پر سیلیو بلّی کے پنجوں کے نشانات کا پرنٹ حاصل کیا تھا۔ اس نے بلاٹنگ پیپر کا یہ ٹکڑا اس ممی کے پنجوں تلے رکھ کر دیکھا۔ ساتوں ناخن اِن نشانوں پر پورے اترتے تھے۔

دفعتہً مسٹر ٹریلانی نے غضب ناک ہو کر اس ممی کی گردن دونوں ہاتھوں

سے دبوچ لی۔ اُسی لمحے مارگریٹ کی آواز تہ خانے میں گونجی۔

"ڈیڈی، یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ ایسا نہ کیجیے، ممکن ہے یہ موذی جانور آپ کو پھر زخمی کر ڈالے۔"

"یہ اب میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔" مسٹر ٹریلانی نے جواب دیا اور ممی کو اُٹھا کر تہ خانے سے باہر چلے ــــــ

"آپ کہاں جا رہے ہیں؟" مارگریٹ نے سہمی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"باورچی خانے میں ــــــ اور اسے آگ میں جھونک دوں گا تاکہ مستقبل میں بھی اس کی وجہ سے کسی خطرے کا خدشہ باقی نہ رہے۔ جب تک اس کا مادی جسم برقرار رہے گا، اس میں روح واپس آکر ہمیں نقصان پہنچا سکتی ہے اور اگر جسم راکھ کا ڈھیر ہو جائے تب روح ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی؛ لٰہذا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہم اس بلی کے خونیں پنجوں کا شکار ہونے سے بچ جائیں گے۔"

یہ کہہ کر مسٹر ٹریلانی نے مجھے اور ڈاکٹر ونچسٹر کو ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔

مارگریٹ نے زور زور سے رونا شروع کر دیا۔ مَیں اس کے قریب گیا اور تسلّی دینے کی کوشش کی، مگر اُس نے مجھے پرے رہنے کی ہدایت کی اور آہستہ سے کہا:

"میرے نزدیک نہ آئیے ــــ پرے رہیے ــــ ڈیڈی کے ساتھ جائیے۔ شاید انہیں آپ کی ضرورت پڑے۔ اُف خدایا... یہ تو قتل ہو گا... شہزادی کی پیاری بلی کو آگ میں جھونک دیا جائے گا...."

ان الفاظ کے ساتھ ہی اس نے پھر رونا اور سسکیاں بھرنا شروع کر دیا۔ میری سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا کہ کیا کروں اور کیا نہ کروں۔ آخر مَیں باورچی خانے کی طرف دوڑا ــــــ

باورچی خانے میں خشک لکڑیوں کا ایک بڑا ڈھیر پہلے سے جمع کر دیا گیا تھا۔ مسٹر ٹریلانی اس ڈھیر پر مٹی کا تیل چھڑک کر دیا سلائی دکھا چکے تھے اور اب آگ کے اونچے اونچے نارنجی شعلے باورچی خانے کی سنگین چھت کو چھونے کی

کوشش کر رہے تھے۔ آگ لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتی جا رہی تھی حتیٰ کہ اس کی حدّت اتنی شدید ہو گئی کہ ہمارے لیے وہاں کھڑے رہنا ممکن نہ رہا، تب مسٹر ٹریلانی نے بلی کی ممی کو ان شعلوں میں پھینک دیا۔ ہمارا خیال تھا کہ آگ کے یہ بھڑکتے اور لپکتے ہوئے شعلے چشم زدن میں ممی کو راکھ کے ڈھیر میں تبدیل کر دیں گے، لیکن یہ دیکھ کر حیرت کی انتہا نہ رہی کہ پانچ منٹ تک بلی کی ممی آگ میں پڑی رہی اور اسے کچھ نہ ہُوا ــــــ پھر آہستہ آہستہ اس کے بدن میں حرکت پیدا ہوئی، اس کا ایک ایک رونگٹا کھڑا ہو گیا۔ منہ بھیانک انداز میں کھل گیا اور دُم پوری طرح اکڑ گئی۔ اگلے پیروں کے پنجوں میں چُھپے ہوئے ساتوں لمبے لمبے ناخن باہر آ گئے اور قریب تھا کہ دہشت کے مارے ہم سب وہاں سے بھاگ کھڑے ہوں کہ ممی نے آگ پکڑ لی اور دیکھتے دیکھتے اس کا جسم راکھ میں تبدیل ہو گیا۔ باورچی خانے میں اسکے جلنے سے انتہائی ناگوار بدبُو پھیل گئی۔ ہم نے اطمینان کا سانس لیا اور وہاں سے پھر تہ خانے میں آ گئے۔ وہاں گھُپ اندھیرا تھا۔ نہ جانے برقی قمقمے کس طرح گُل ہو گئے تھے۔ مسٹر ٹریلانی کے ہوش اڑ گئے۔ انہوں نے حلق پھاڑ کر نعرہ لگایا:

"مارگریٹ... مارگریٹ... کہاں ہو تم؟"

"ڈیڈی، میں یہاں ہوں ــــ" تہ خانے کے ایک گوشے سے مارگریٹ کی لرزتی آواز ہمارے کانوں میں آئی۔

"یہ بتیاں کس نے بُجھائی ہیں؟" مسٹر ٹریلانی نے پوچھا۔

"مَیں نے ــــ" مارگریٹ نے جواب دیا۔ "مجھے ان کی تیز روشنی سے وحشت ہو رہی تھی۔"

"میری بچّی کیا تجھے ڈر تو نہیں لگ رہا؟" مسٹر ٹریلانی نے اُسے آغوش میں لے کر پیشانی چومتے ہوئے پوچھا۔ پھر ایک قمقمہ روشن کر دیا۔ میں نے دیکھا کہ مارگریٹ اپنے والد کے شانے پر سر رکھے سسکیاں لے رہی ہے۔ میرے قدموں

کی آہٹ پاکر اس نے آنسو بھری آنکھیں اوپر اٹھائیں اور کہنے لگی :

"مسٹر روز ، مہربانی کر کے تمام بتیاں روشن کر دیجیے ۔"

میں نے کچھ کہے بغیر اس کے حکم کی تعمیل کی۔ مارگریٹ نے اپنے والد سے الگ ہو کر آنسو پونچھے اور ایک گوشے میں بیٹھ گئی۔ اس کا حسن سوگوار بھی ایک نرالی شان سے جلوہ گر تھا۔ میں نے دیکھا کہ پیاری بیٹی کی اس حالت پر مسٹر ٹریلانی بھی غم زدہ ہیں ، تاہم انہوں نے ضبط کر کے باری باری ہماری طرف دیکھا اور بے حد سنجیدہ لہجے میں گویا ہوئے۔

"حضرات ، اب وقت ضائع کیے بغیر ہمیں اپنے اہم کام کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ انہی باتوں میں وقت پر لگا کر اڑ جائے اور ہم ہاتھ ملتے رہ جائیں —— شہزادی تارا کی ممی کو یہاں لے آئیے تاکہ اس کے بدن سے پٹیاں اتارنے کا عمل شروع کیا جائے —"

مارگریٹ یہ بات سنتے ہی حد درجہ مضطرب ہو کر اٹھی اور اپنے والد کے قریب آئی۔ اس کے چہرے کا رنگ یکدم ہلدی کی طرح زرد پڑ گیا تھا۔ اُس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا :

" مگر ... ڈیڈی ... یہ آپ کیا کر رہے ہیں ؟ کچھ تو سوچیے .... آپ اُسے اتنے آدمیوں کی موجودگی میں .... اور اتنی تیز روشنی میں اُسے برہنہ...؟"

یہ کہہ کر وہ رونے لگی۔

"یہ ظلم ہے ڈیڈی ... یہ بربریت ہے ... آپ کو ایک عظیم شہزادی کی لاش کے ساتھ یہ بہیمانہ سلوک نہیں کرنا چاہیے ..."

مارگریٹ پر شدتِ جذبات سے عجب کیفیت طاری تھی۔ ہم میں سے کسی نے بھی زبان سے کوئی لفظ نہ نکالا۔ اس کے رخسار یک لخت سرخ ہو گئے اور آنکھوں سے شرارے نکلنے لگے۔ مسٹر ٹریلانی عجب گومگو کے عالم میں تھے۔ کبھی ہماری طرف دیکھتے ، کبھی اپنی بیٹی کی طرف تکتے۔ آخر انہوں نے مدھم آواز

میں اُسے سمجھایا کہ یہ کارروائی بہت ضروری ہے اور شہزادی تارا کی رُوح کو سکون پہنچانے کی غرض سے کی جا رہی ہے۔ اس کی بے حرمتی کرنا ہمارا مقصود نہیں ہے۔ اگر ایسی بات ہوتی تو وہ جوشِ انتقام سے ہمیں کبھی زندہ نہ چھوڑتی۔

"لیکن .... پھر بھی وہ بہرحال میری طرح ایک عورت ہے ... اور آپ یوں اُسے تیز روشنی میں برہنہ کر دینے کا ارادہ کر رہے ہیں —" مارگریٹ نے کہا اور مسٹر ٹریلانی نے بے بس ہو کر میری طرف دیکھا۔ میں ان کی نگاہوں کا مطلب سمجھ گیا۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ اب تم ہی مارگریٹ کو سمجھاؤ۔ چنانچہ میں آگے بڑھا اور میں نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔ اب وہ میرے کندھے سے لگ کر رونے لگی۔ میں نے کہا :

" مارگریٹ ، تمہارا اعتراض اپنی جگہ درست ہے ، لیکن یہ تو سوچو کہ وہ محض ممی ہے۔ اور اُسے مرے ہوئے پانچ ہزار سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ زمانہ قدیم کے مصر میں عورتوں کی بھلا کیا حیثیت تھی ! کوئی عورت طب کا پیشہ اختیار نہیں کر سکتی تھی ، چنانچہ سارے کام مرد ہی کرتے ، حتیٰ کہ شہزادیوں کی لاشوں کو بھی مرد ہی حنوط کیا کرتے تھے ۔"

"تم نے بالکل ٹھیک کہا۔" مسٹر ٹریلانی نے میری تائید کی۔ " اب ہمیں دیکھ لو ، مصر کے قدیم مقبروں سے جو لاشیں ہم نے نکالی ہیں۔ اُن میں مَردوں کی ممیاں بھی تھیں ، عورتوں کی بھی —— میں نے اور کاربیک نے سینکڑوں ممیاں عورتوں کی برآمد کی ہیں اور اُن کے جسموں سے پٹیاں اتاری ہیں۔ اس مہم میں کوئی عورت ہماری شریک کار نہ تھی۔ پھر ڈاکٹر ونچسٹر کو دیکھ لو ، وہ مَردوں کے امراض کا علاج بھی کرتے ہیں اور عورتوں کو بھی دیکھتے ہیں —— یہ اُن کے فرائض میں داخل ہے۔ اس میں کسی طرح بھی "جنس" کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا ۔"

چند لمحے خاموش رہنے کے بعد مسٹر ٹریلانی نے دوبارہ کہنا شروع کیا :

"میری عزیز بیٹی، تم جو بات کہنا چاہتی ہو، ہم اس کا مفہوم بخوبی سمجھ رہے ہیں، لیکن یقین کرو، ایسی کوئی بات ہمارے ذہنوں میں نہیں آسکتی کہ ہم اس عظیم شہزادی کے تقدس کو مجروح کریں یا اس کی بے حرمتی کا خیال دل میں لائیں —— یُوں سمجھ لو کہ مَیں اُسے بھی تمہاری طرح اپنی ایک بیٹی ہی سمجھ رہا ہوں۔ اِس لیے ان وہموں کو اپنے ذہن سے دُور کرو اور اِس کام میں ہمارا ساتھ دو۔ یہ زندگی اور موت کا معاملہ ہے۔ اگر ہم کامیاب رہے تو سائنس کو ایک نیا تجربہ مل جائے گا اور ہمارے نام تاریخ کا حصّہ بن جائیں گے —— شہزادی کے جسم کو پٹیوں سے آزاد کرنا اس لیے بھی ضروری ہے کہ زندہ ہونے کے بعد وہ آسانی سے حرکت کر سکے گی ورنہ اس کا زندہ ہونا یا نہ ہونا بالکل بے کار ہو گا۔"

اِس تقریر سے مارگریٹ کے دل کو کچھ اطمینان ہو گیا۔ اس نے کہا:

"آہ ڈیڈی، اَب میں مطمئن ہوں۔ آپ اپنا کام شروع کریں۔"

مسٹر ٹریلانی نے ڈاکٹر ونچسٹر اور پروفیسر کاربیک کی مدد سے وہ تابوت کھولا اور اس میں سے شہزادی تارا کی ممی نکال کر شاہ بلوط کی میز پر رکھی۔ خدا رحم کرے۔ مارگریٹ اور شہزادی تارا کی شکلوں میں اس قدر مشابہت تھی کہ مَیں حیران رہ گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مارگریٹ ہی میز پر لیٹی ہوئی ہے۔ برقی قمقموں کی تیز روشنی اس کے پُروقار اور حسین چہرے پر پڑ رہی تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ گہری نیند میں ہے۔

ونچسٹر، کاربیک اور مسٹر ٹریلانی نے آہستہ آہستہ اس کے جسم کو پٹیوں سے آزاد کرنا شروع کیا۔ یہ عمل نہایت سُست رَو اور تکلیف دہ تھا۔ پٹیاں آسانی سے نہیں اتر رہی تھیں۔ شاید ان کو ایسے مسالے سے تر کیا گیا تھا جو سریش کی طرح چپک جاتا تھا، تاہم ڈاکٹر ونچسٹر نے اس موقع پر حیرت انگیز مہارت کا ثبوت دیا اور تیزی سے پٹیاں اُتاریں۔

جوں جوں پٹیاں اترتی جاتی تھیں، میرے دل کی دھڑکن تیز ہو رہی تھی۔ مارگریٹ اپنی جگہ بے حس و حرکت کھڑی تھی اور مسز گرانٹ پلک جھپکائے بغیر یہ کارروائی

دیکھ رہی تھیں۔

مجھے ابھی تک مسٹر ٹریلانی نے اس کام میں شریک ہونے کے لیے نہیں کہا تھا۔ اس لیے مَیں چُپ چاپ اپنی جگہ کھڑا تھا۔ چند لمحوں بعد مارگریٹ میرے قریب آئی اور میرا ہاتھ تھام کر کھڑی رہی۔ مَیں نے محسوس کیا کہ اس کا ہاتھ کانپ رہا ہے اور سانس لینے کی رفتار بھی ہر لحظہ تیز ہوتی جا رہی ہے۔

رفتہ رفتہ تہ خانے میں اُتری ہوئی پٹیوں کا ڈھیر لگتا جا رہا تھا۔ مَیں نے دیکھا کہ یہ پٹیاں نہایت نفیس اور باریک ریشمی کپڑے کی بنی ہوئی تھیں۔ ان کا رنگ ہلکا سبز تھا اور ہر پٹی پر نہایت خوبصورت نقش و نگار بنائے گئے تھے۔ اِن نقوش کو اتنی محنت سے بنایا گیا تھا کہ انسانی عقل دنگ رہ جاتی تھی، اور کمال یہ تھا کہ کئی ہزار برس گزر جانے کے باوجود نہ کپڑا بوسیدہ ہوا تھا اور نہ اُن رنگوں کی آب و تاب میں کوئی کمی واقع ہوئی تھی۔

آخری پٹی اتارنے سے قبل مسٹر ٹریلانی نے اپنی بیٹی کی طرف دیکھا جو اَب اتنے زور زور سے ہانپ رہی تھی کہ اس کی آواز سے تہ خانہ گونج رہا تھا۔

"بیٹی، اطمینان رکھو —— شہزادی نے شاہی لباس زیب تن کر رکھا ہے۔ اس کی بے حرمتی ہرگز ہرگز نہ ہونے پائے گی ——"

بلاشبہ ایسا ہی تھا۔ جب آخری پٹی الگ کی گئی تو نیچے سے شاہی لباس برآمد ہوا۔ یہ کپڑا نہایت عمدہ اور بے حد نفاست سے بُنا گیا تھا اور سر سے لے کر پاؤں تک پورے لباس میں بیش قیمت لعل و جواہر ٹکے ہوئے تھے۔ لباس کے حاشیے پر سونے چاندی کے باریک تاروں سے خطِ تصویر میں شہزادی تارا کی مکمل سوانح عمری لکھی گئی تھی۔ شہزادی کی گردن میں کبوتر کے انڈے کے برابر سات ہیروں کا ایک قیمتی ہار بھی پڑا تھا جس کی چمک اتنی تیز تھی کہ آنکھیں خیرہ ہوئی جاتی تھیں۔ مسٹر ٹریلانی نے نہایت احترام سے یہ ہار اُتارا اور آگے بڑھ کر مارگریٹ کی گردن میں ڈال دیا۔ چند لمحوں بعد انھوں نے

شہزادی کی شاہی پوشاک بھی احتیاط سے اُتار لی ، اور جلدی سے دو سفید ریشمی چادروں سے اُس کا مرمریں بدن ڈھانپ دیا۔ ملکہ کے بازو، گردن اور پیر کسی قدر کھُلے چھوڑ دیے گئے تھے۔ اسے دیکھ کر کوئی شخص نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ پانچ ہزار سال پرانا مُردہ جسم ہے۔

مَیں نے مارگریٹ کی سسکیوں کی آواز دوبارہ سُنی۔ وہ کہہ رہی تھی:

"ڈیڈی، ابھی آپ کے تجربے کی تکمیل میں بہت دیر ہے۔ اس لیے بہتر ہے کہ آپ لوگ یہاں سے چلے جائیں۔ مَیں شہزادی کے پاس رہوں گی۔"

اس درخواست پر مسٹر ٹریلانی نے چند لمحے غور کیا، پھر اثبات میں گردن ہلائی اور ہم لوگ مارگریٹ کو شہزادی تارا کی ممی کے پاس چھوڑ کر تہ خانے سے باہر آ گئے۔ ایک گھنٹے بعد جب ہم دوبارہ تہ خانے میں داخل ہوئے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ شہزادی تارا کی گردن میں سات ہیروں کا وہی ہار پڑا تھا۔ شاہی لباس اُسے دوبارہ پہنا دیا گیا تھا، اس کے سرہانے سات موم بتیاں روشن تھیں اور سینے پر تازہ پھولوں کا ایک ڈھیر پڑا تھا۔ شہزادی کو یوں دیکھ کر ہم سب کی آنکھوں میں حیرت اور مسرت سے آنسو آ گئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ نہایت آرام کی نیند سو رہی ہے۔

"میری بچی ـــــ" مسٹر ٹریلانی نے محبت سے بے تاب ہو کر مارگریٹ کو سینے سے لپٹا لیا۔ "مَیں جب بھی شہزادی تارا کو دیکھتا ہوں تو یہ خیال آتا ہے کہ اس میں اور میری پیاری مارگریٹ میں کیا فرق ہے۔"

پھر وہ شہزادی تارا کی طرف بڑھے اور جھک کر اُس کی پیشانی چوم لی۔

مسٹر ٹریلانی کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی اور وہ ہچکیاں لے لے کر رونے لگے۔ یہ ایک عجیب منظر تھا جسے میں مرتے دم تک فراموش نہ کر سکوں گا، اور یقیناً یہ فریبِ نظر ہرگز نہ تھا کہ ہم نے اُنھی لمحوں میں ممی کے جسم اور چہرے میں حیرت انگیز تغیر برپا ہوتے دیکھا۔ اس کا چہرہ پہلے سے کہیں زیادہ شاداب

اور روشن ہو گیا۔ یاقوتی لبوں پر نہایت دلفریب اور معصوم تبسّم پھیلنے لگا، حتیٰ کہ ہمیں اس کے موتیوں جیسے سفید دانتوں کی ایک جھلک بھی دکھائی دی۔ مَیں نے دیکھا کہ پروفیسر کاربیک پلک جھپکائے بغیر شہزادی تارا کو گھور رہا تھا۔ اس کے چہرے پر حد درجہ خوف اور کرب کے آثار تھے اور دونوں ہاتھ کانپ رہے تھے۔ پھر اس نے آہستہ سے کہا:

"خدا کی پناہ . . . یُوں لگتا ہے جیسے میرے سامنے مارگریٹ کی لاش پڑی ہے . . ."

اُس نے اگرچہ یہ بات زیرِ لب کہی تھی، لیکن تہ خانے میں پھیلی ہوئی موت کی خاموشی میں اس کی آواز نہ صرف میرے کانوں تک پہنچی، بلکہ مسٹر ٹریلانی نے بھی سُن لی۔ اُنھوں نے گردن گھما کر کاربیک کی طرف دیکھا اور کہا:

"ہاں میرے عزیز دوست، تمہارا کہنا صحیح ہے ـــــ ان دونوں میں بال برابر بھی فرق نہیں ہے۔ سوائے اس کے کہ ایک زندہ ہے اور ایک پانچ ہزار برس سے مُردہ ـــــ تاہم تھوڑی دیر میں دوسرے وجود کو بھی ابدی حیات مل جائے گی ـــــ"

وقت چیونٹی کی رفتار سے چل رہا تھا۔ مَیں نے گھڑی پر نگاہ ڈالی، دو بجنے میں چند منٹ باقی رہ گئے تھے جبھی میں نے مارگریٹ کو دیکھا۔ اس کے چہرے کا رنگ ہر لمحہ بدلتا جا رہا تھا۔ کبھی سفید، کبھی سُرخ اور کبھی زرد ـــ وہ دُنیا و مافیہا سے بالکل بے خبر اپنی ہم شکل شہزادی تارا کو تکے جا رہی تھی۔

"براہِ کرم سب لوگ اپنے چہروں پر گیس نقاب چڑھا لیں۔" مسٹر ٹریلانی کی آواز تہ خانے میں گونجی۔ سب نے فوراً اُن کے حکم کی تعمیل کی۔ مسٹر ٹریلانی نے شہزادی کا کٹا ہوا ہاتھ جیب سے نکالا اور اُسے اس کی چھاتی پر رکھ دیا، پھر انھوں نے تینوں چراغ اُٹھائے، ان میں تیل بھرا جا چکا تھا۔ یہ چراغ تہ خانے کی اُس کھڑکی میں رکھ دیے گئے جو سمندر کی جانب کھُلتی تھی۔ آسمان پر مطلع صاف

ہو چکا تھا اور تارے خوب روشن تھے۔ میری نظر اُن سات تاروں پر پڑی جنھیں دبِّ اکبر کہا جاتا ہے۔ مجھے احساس ہوا کہ یہ ساتوں تارے خاصے بڑے اور بے حد روشن ہو گئے ہیں۔ سات ستاروں والا یاقوت بھی اِن چراغوں کے قریب رکھ دیا گیا۔

"مسٹر مالکم روز، براہِ نوازش آپ بجلی کے سوئچ کے قریب کھڑے ہوں تاکہ ضرورت پڑنے پر قمقمے روشن کر سکیں ــــ" مسٹر ٹریلانی نے کہا اور مَیں نے تعمیل کی ــــ میری نگاہیں اس پُراسرار یاقوت پر جمی ہوئی تھیں جس کا رنگ آہستہ آہستہ تیز ہوتا جا رہا تھا، حتیٰ کہ وہ کبوتر کے خون کی مانند سُرخ اور چمکدار ہو گیا۔ مَیں نے دیکھا کہ دبِّ اکبر کے ستاروں کی کرنیں اِس یاقوت پر پڑ رہی تھیں اور آسمان سے لے کر زمین تک اِن کا ایک تار بندھ گیا تھا۔ شہابِ ثاقب کا بنا ہوا وہ طلسمی صندوقچہ بھی کھڑکی کے پاس رکھ دیا گیا تھا اور اِس کے اوپر کندہ نقوش اور لکیریں بھی رنگ بدل رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے اِن شریانوں اور رگوں میں خون تیزی سے گردش کر رہا ہے۔

دفعتہً یہ ڈبا سفید ہو گیا اور پھر آہستہ آہستہ اس کا ڈھکنا کھُلنے لگا۔ اِس کے اندر سیاہ رنگ کی ایک بلّی بیٹھی تھی۔ یکایک اس نے آنکھیں کھول دیں، ہلکی سی میاؤں کی آواز سنائی دی اور دوسرے ہی لمحے مجھے چھُوتا ہوا ایک جاندار جسم اِس بلّی کی طرف لپکا۔ یہ مارگریٹ کی پالتو بلّی تھی۔ اس کے بعد اُن دونوں کی چیخوں سے پورا مکان لرز اُٹھا۔

"خبردار، کوئی شخص اپنی جگہ سے حرکت نہ کرے ــــ" مسٹر ٹریلانی کی آواز سنائی دی۔ 'اُف خدایا' وہ لمحات کیسے خوفناک تھے ... آج بھی یاد کرتا ہوں تو رونگٹے کھڑے ہونے لگتے ہیں۔ دیر تک اِن دونوں بلّیوں میں جنگ ہوتی رہی، حتیٰ کہ ڈبّے والی کالی بلّی کے جسم میں آگ لگ گئی اور دیکھتے دیکھتے وہ راکھ کے ڈھیر میں تبدیل ہو گئی۔ مارگریٹ کی پالتو بلّی چند لمحے غراتی رہی

پھر کھڑکی کے راستے باہر نکل کر غائب ہو گئی۔ بلّی کے جاتے ہی اِس طلسمی صندوقچے کے ریزے ریزے ہو گئے اور ان میں سے دھوّاں اُٹھنے لگا۔ یہ غبار آلود دھوّاں تھا۔ کسی قدر سفید، کسی قدر نیلا ــــ یہ دھوّاں بل کھاتا ہُوا ہم سب کے گرد جمع ہونے لگا اور گیس نقاب اوڑھنے کے باوجود مجھے ایک عجیب سی خوشبو کا احساس ہُوا جو نہایت مسحُور کن تھی اور جس نے چند لمحوں کے لیے میرے ہوش و حواس مختل کر دیے۔ مَیں نے دائیں بائیں دیکھا، مگر دھوئیں کی وجہ سے کچھ دکھائی نہ دیا۔

یکایک کھڑکی میں ایک نیلگوں شعلہ سا لپکا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک چراغ خود بخود روشن ہو گیا ہے۔ چند سیکنڈ بعد دوسرا چراغ جلا، اس کے بعد تیسرا ــــ ان چراغوں کی لَو کئی رنگوں کا مجموعہ تھی جو ہر آن بدل رہے تھے۔ اِن چراغوں کے روشن ہوتے ہی تہ خانے میں گاڑھا گاڑھا سفید دھوّاں اور پھیلنے لگا، حتیٰ کہ اس نے ہر شے کو مکمّل طور پر اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ چراغوں کی تیز روشنی آہستہ آہستہ مدّھم ہونے لگی اور پھر بالکل غائب ہو گئی۔ ایک ثانیے کے لیے مجھے اپنے دِل کی دھڑکن رُکتی ہوئی محسوس ہوئی۔ کیونکہ مَیں نے اُسی لمحے ایک سفید سائے کو تہ خانے میں گھومتے ہوئے دیکھا۔ پھر نہ جانے کیونکر مَیں نے حرکت کی اور اپنی جگہ سے آگے بڑھا۔ اس وقت میرے دِل میں سوائے مارگریٹ کے اور کسی کا خیال نہ تھا۔ میرا پیر کسی چیز سے ٹکرایا اور ایک بے جان جسم لڑھک کر فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ مَیں نے کانپتے ہاتھوں سے اِس جسم کو چھُوا۔ یہ یقیناً ڈاکٹر ونچسٹر کا جسم تھا، کیونکہ وہی میرے دائیں ہاتھ کھڑا تھا۔

"مسٹر ٹریلانی، کیا مَیں سوئچ دبا دوں؟" میرے حلق سے گھُٹی گھُٹی آواز نکلی۔ کوئی جواب نہ ملا۔ پھر مَیں نے اُس میز کی طرف غور سے دیکھا جس پر شہزادی تارا کی ممی رکھی گئی تھی۔

"مارگریٹ ... مارگریٹ ..." مَیں نے آواز دی، اور اُسی لمحے گیس

نقاب چہرے سے الگ کر دیا۔

"مسٹر روز . . . ." میرے کانوں میں مارگریٹ کی ہلکی آواز آئی۔ "براہ کرم قمقمے روشن کر دیجیے۔"

مَیں نے پیچھے ہٹ کر سوئچ ٹٹولا اور قمقمے روشن کر دیے۔ تیز روشنی میں تہ خانے کا ایک ایک گوشہ جگمگا اُٹھا۔ مارگریٹ اپنی جگہ کھڑی جھوم رہی تھی اور اگر مَیں لپک کر اُسے سنبھال نہ لیتا تو وہ دھڑام سے زمین پر گر جاتی۔ مَیں نے اُسے بازوؤں میں لے لیا۔

"براہ کرم دوسروں کی خبر لیجیے۔" مارگریٹ نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔ "میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

تب میں نے اُسے آرام سے ایک کوچ پر لِٹا دیا اور دوسروں کی خبر لینے کو مڑا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ڈاکٹر ونچسٹر، مسٹر ٹیلانی، پروفیسر کاربیک اور مسز گرانٹ تہ خانے کے فرش پر بے حس و حرکت پڑے ہیں۔ میرے ہوش اُڑ گئے۔ میں نے چلّا کر کہا:

"سب لوگ مر گئے۔"

"نہیں، وہ زندہ ہیں۔" مارگریٹ کی آواز میرے کانوں میں آئی۔ "صرف بے ہوش ہو گئے ہیں۔"

مَیں نے جلدی جلدی اُن کے چہروں سے گیس نقاب اُتارے اور اُن کے سینوں پر ہاتھ رکھا۔ واقعی سب زندہ تھے، مگر ان کے دل رُک رُک کر حرکت کر رہے تھے۔ دُھواں تیزی سے کھڑکی کے راستے باہر نکل رہا تھا۔

شہزادی تارا کا تابوت اُسی طرح ایک طرف پڑا تھا، مگر میز پر سے اس کی ممی غائب تھی —— مسٹر ٹیلانی نے اُس کے اوپر جو چادریں ڈالی تھیں، وہ اسی طرح وہاں پڑی تھیں۔ مَیں نے بے ہوش پڑے ہوئے افراد کے منہ پر

پانی کے چھینٹے دیے اور اُنہوں نے یکے بعد دیگرے آنکھیں کھول دیں۔ انہیں اپنے اوسان بحال کرنے میں خاصی دیر لگی۔

تہ خانے میں ہر شے پر باریک بھورے رنگ کی خوشبودار گرد جمی ہوئی تھی۔ کھڑکی میں رکھے ہوئے تینوں چراغ بھی غائب تھے —— ہاں، ایک چیز اب بھی چمک دار تھی اور وہ سات ستاروں والا بیش قیمت یاقوت تھا۔

اُسی سال موسمِ خزاں کے ایک اُداس اور ابر آلود دن میں میری شادی مارگریٹ سے ہو گئی۔ شادی کے روز اُس نے سات ستاروں والا یاقوت بڑے چاؤ سے اپنے گلے میں پہنا اور بے حد خوش ہوئی۔ ہماری شادی کے اگلے سال خدا نے میری بیوی کی گود بھر دی۔ مگر یہ دیکھ کر ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ اگرچہ نوزائیدہ بچی کے دونوں ہاتھوں میں پانچ پانچ اُنگلیاں تھیں، مگر اس کے دائیں ہاتھ کے درمیان میں سات ستاروں کے نقوش مدھم لکیروں کی شکل میں نمایاں تھے۔ شہزادی تارا ہمیں اپنی ایک اور نشانی دے گئی تھی۔ ہم شہزادی کو کبھی نہیں بھولتے اور ہر سال اس کی یاد میں ایک خاص تقریب کا اہتمام کرتے ہیں۔ جس میں سات کے عدد کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے۔

KitabPK.Com